تاریخ کی آگہی

ڈاکٹر مبارک علی

نام کتاب : تاریخ کی آگاہی
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
پبلشر : ThaaP Publications
اہتمام : ESNA Services- 0333-4769230
سرورق : لالہ رخ
پرنٹرز : شاہ محمد پرنٹرز، لاہور
اشاعت اوّل : 2009
صفحات : 192
قیمت : 225/- روپے

ISBN : 978-969-9359-02-6

THAAP PUBLICATIONS TRUST FOR HISTORY ART & ARCHITECTURE OF PAKISTAN
43 G-Gulberg III, Lahore
Tel: 042-5880822, Fax 042-5725739,
email:thaappublications@gmail.com

ترتیب

پیش لفظ

موجودہ دور میں علم کا بہاؤ اس قدر تیز رفتاری سے جاری ہے کہ اس پر قابو پانا اور اس کو سمیٹنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے علم کا حصول اور نئے خیالات و افکار سے واقفیت کے بغیر حالات کو سمجھنا مشکل سے مشکل ہو رہا ہے۔ لہٰذا قوموں کی ترقی اور ان کی طاقت علم کے حصول اور اس کے استعمال میں ہے۔ خاص طور سے تاریخ کا مضمون سماجی حالات اور مسائل کو سمجھنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اس کتاب میں جو مضامین شامل ہیں ان کا مقصد تاریخی آگہی کو پیدا کرنا ہے تاکہ ہم اپنے ماحول اور حالات کو سمجھ سکیں۔

مبارک علی

برج کالونی، لاہور کینٹ

جون 2009ء

اشیاء کی تاریخ

تاریخ نویسی کا دائرہ اب دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اب وہ ان پہلوؤں پر بھی تحقیق کر رہی ہے کہ جنہیں اس سے پہلے مورخوں نے نظر انداز کیا تھا اور زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مثلاً ہم روزمرہ کی زندگی میں بہت سی اشیاء اور چیزوں کو استعمال کرتے ہیں لیکن ہمیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ ان کی بھی اپنی تاریخ ہے۔ انہیں استعمال کرتے ہوئے ہمارا خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ بے جان چیزیں ہیں اور ان کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہے کہ یہ وقتاً فوقتاً استعمال ہوتی ہیں لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ یہ اشیاء اپنی طویل تاریخ رکھتی ہیں ان کا استعمال ہر دور اور ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے۔

روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء وقت کی ضرورت کے تحت بنتی اور ختم ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے جب ان پر تحقیق کی جاتی ہے اور ان کی ضرورت کو سمجھا جاتا ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا سماج کے معاشی، سماجی سیاسی اور کلچرل پہلوؤں پر کیا اثرات تھے۔

مثلاً قدیم تہذیبوں کے بارے میں ہماری معلومات کا انحصار ان اشیاء پر ہے کہ جو ماہرین آثار قدیمہ نے کھدائی کے دوران دریافت کی ہیں۔ چونکہ قدیم زمانے کی معلومات کے بارے میں ہمارے پاس تحریری مواد نہیں ہے اور اگر ہے تو اس کے ذریعہ بہت کم معلومات ملتی ہیں مگر ان کے استعمال کی جو اشیاء دریافت ہوئی ہیں۔ وہ اس تہذیب کے بارے میں بہت اہم اور مصدق معلومات فراہم کرتی ہیں۔ ان اشیاء میں جو برتن ملے ہیں ان کی بناوٹ اور ان کے استعمال سے لوگوں کے رہن سہن اور عادات کا پتہ چلتا ہے جو زیورات ملے ہیں ان سے لوگوں کے زوق جمالیات کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں میں جسمانی آرائش کا شوق تھا۔ بچوں کے کھلونے اس بات کی نشاندہی کرتے

ہیں کہ سماج میں ان کی اہمیت تھی اور انہیں مصروف رکھنے کے لیے قسم قسم کے کھلونے بنائے جاتے تھے۔ دیوی دیوتاؤں کے مجسمے اور بتوں سے ان کے فن کا اندازہ ہوتا ہے اور اس عقیدت کا بھی کہ جو ان سے وابستہ تھی۔ لہٰذا مورخ اور آثار قدیمہ کے ماہرین ان اشیاء کی بنیاد پر قدیم تہذیب اور قدیم لوگوں کی سماجی و معاشی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ چیزیں ماضی کو حال سے ملاتی ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی اشیاء جو قدیم تہذیبوں میں استعمال ہوتی تھیں وہ آج بھی اس شکل میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ یہ تاریخ کے ایک تسلسل کی داستان ہے۔

ان اشیاء کی تاریخ سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کس طرح سے تہذیب ارتقائی طور پر مراحل طے کرتی ہیں اور آگے بڑھتی ہیں۔ جب کہ کچھ تہذیبیں ایک مرحلہ پر آکر رک جاتی ہیں۔ اور ختم ہو جاتی ہیں۔ ان اشیاء سے ہم کسی بھی تہذیب کے لوگوں کو ذہن کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کس قدر ایجاد کی خواہش تھی۔ ان میں خوبصورتی کے کیا احساسات تھے۔ اب ان قدیم اشیاء کو میوزیم میں رکھ دیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کے مشاہدے کے بعد انسانی تہذیب کے ارتقاء اور ترقی کے بارے میں ٹھوس بنیادیں فراہم ہوسکیں۔

تاریخ میں ان اشیاء کا اہم کردار یہ ہے کہ تجارت کے ذریعہ ایک قوم کی استعمال کرنے والی چیز دوسری قوم کے پاس چلی جاتی ہے جو دونوں قوموں کے درمیان کلچرل کو قائم کرتی ہے۔ اگرچہ قدیم زمانے میں تجارتی اور کلچر رابطے بہت آہستگی سے طے ہوتے تھے مگر اس کے باوجود ایک چیز جو کسی ایک خطہ میں ایجاد ہوئی یا اسے بنایا گیا کے بارے میں بتایا گیا ہے وہ آہستہ آہستہ دوسری تہذیبوں تک پہنچ گئی۔ جس کی وجہ سے لوگوں کے طرز رہائش اور صورت میں تبدیلی آئی۔ اس سلسلہ میں فیشن نے قوموں کو ایک دوسرے سے ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔ لباس، جوتے، کھانے کے برتن اور اس طرح دوسری اشیاء برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتی رہیں۔

جن چیزوں کے روشناس ہونے سے ملکوں کے سماجوں میں تبدیلی آئی۔ ان میں سے دو قابل ذکر ہیں۔ پہیہ اور آگ جو آہستہ آہستہ پوری دنیا میں پھیل گئے۔ ان کی وجہ سے آمدورفت کے نظام میں تبدیلی آئی۔ اور روزمرہ کی زندگی ان سے اثر انداز ہوکر تبدیل ہوگئی۔

ہمارے پاس اب جو تاریخی معلومات ہیں ان کی بنیاد پر ہم اس بات کا تجزیہ کر سکتے ہیں کہ ہماری روزمرہ کی زندگی پر چیزوں کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ ہمیں اس کا بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کے استعمال سے ہماری جسمانی حرکات وسکنات کس طرح سے بدل جاتی ہیں مثلاً ایک زمانہ تھا کہ ہمارے ہاں لوگ قالین پر بیٹھتے تھے۔ اس نشست میں خاندان کے افراد اور دوست واحباب مل کر جب قریب قریب بیٹھتے تھے تو ان میں شرکت کا احساس ہوتا تھا لیکن اب جب ہم صوفوں پر اور کرسیوں پر بیٹھتے ہیں تو اس میں شرکت سے زیادہ انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد اس ڈھیلے ڈھالے لباس میں قالین پر بیٹھ کر زیادہ آرام دہ سمجھتے تھے۔ جب لوگ قالین پر بیٹھتے تھے تو ان کی جسمانی حرکات اور ہوتی تھیں لیکن صوفے پر بیٹھنے کی وجہ سے نہ صرف لباس بدل گیا ہے بلکہ جسمانی حرکات بھی بدل گئی ہیں۔ قالین پر بیٹھتے ہوئے جوتے اتار دیئے جاتے تھے مگر کرسی یا صوفے پر جوتوں سمیت بیٹھتے ہیں۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے ٹیکنالوجی کی ایجادات ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ روزمرّہ استعمال کی چیزیں بھی بدل رہی ہیں۔ مثلاً اب نوجوان نسل کو اس کا پتہ بھی نہیں کہ ایک زمانہ میں ہمارے باورچی خانے میں کون کون سی چیزیں استعمال ہوتی تھیں۔ اب سل بٹہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ اور شہروں میں پھکنی کو لوگ بھول گئے ہیں۔ چمٹہ بھی شاید اب کم ہی استعمال ہوتا ہے۔ خوش حال گھرانوں میں اب مسالہ پیسنے، جوس نکالنے اور کھانا گرم کرنے کی مشینیں آ گئی ہیں۔ چونکہ پرانی چیزیں اب تک دیہاتی علاقوں میں استعمال ہوتی ہیں اس لئے ان کی وجہ سے شہری اور دیہاتی زندگی میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ روایتی لباس میں بھی تبدیلی آ رہی ہے۔ حال ہی میں ہندوستان میں ایک سروے کیا گیا تھا جس میں کام کرنے والی خواتین نے کہا کہ ان کے لئے ساڑھی پہن کر کام کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ ان کی نقل وحرکت میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ اس لئے وہ جینز پہننا پسند کرتی ہیں تاکہ باآسانی ادھر ادھر جاسکیں۔ ساڑھی ان کے لئے اب پارٹیوں کے لئے مخصوص ہو گئی ہے۔

بعض دست کار اور ہنر منداپنی بنائی ہوئی اشیاء کی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں۔

جیسے ایک زمانہ میں ڈھاکہ کی ململ مشہور تھی کہ جس کی بنائی میں خاص مہارت کی ضرورت تھی۔اسی طرح بنارس کی ساڑھیاں مشہور ہیں جو وہاں کے دست کاروں کے فن کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔ ہندوستان میں کئی شہر ہیں جو اپنی صنعت کی وجہ سے مشہور ہیں۔

اشیاء کے استعمال سے لوگوں کے سماجی رتبہ کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ امیر لوگ قیمتی لباس اورزیورات استعمال کرتے ہیں۔ جب کہ غریب سستا کپڑا اور آرائش کی چیزوں کو استعمال میں لاتے ہیں۔قدیم چین میں سلک کے کپڑوں کا ستعمال صرف امراء کر سکتے تھے۔ یہاں تک کہ جو کاریگر یہ بناتے تھے وہ بھی انہیں نہیں پہن سکتے تھے۔اسی طرح صرف امراء ہتھیار رکھ سکتے تھے۔ عام لوگوں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ آج کے جدید زمانے میں کار کے ماڈل اور لباس کی تراش خراش سے کسی شخص کے سماجی درجہ کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

چیزوں کے ذریعہ طاقت و اقتدار کا بھی انداز ہوتا ہے۔قدیم زمانے میں تخت تاج اور عصا شاہی علامتیں تھیں۔ آج بھی فوج میں اعلیٰ افسر ایک چھڑی رکھتے ہیں کہ جو طاقت کی علامت ہے۔ اب حکمراں طبقے خود کو ممتاز کرنے کے لئے اپنی کاروں پر جھنڈا لگاتے ہیں۔ جلسوں میں صدارت کی کرسی خاص طور سے اونچی اور منفرد ہوتی ہے چونکہ چیزوں کے ذریعہ مراعات یافتہ اور محروم طبقوں میں فرق رکھا جاتا ہے اس لئے انقلابی تحریکوں میں ان علامات کو ختم کیا جاتا ہے۔لیکن یہ علامت کچھ عرصہ بعد پھر زندہ ہو کر آ جاتی ہیں اور امیر و غریب کے فرق کو قائم رکھتی ہیں۔

تاریخ اور تجسس

تاریخ کی تشکیل اور اسے بنانے میں تجسس کو بڑا دخل ہے۔ کیونکہ انسان میں ان چیزوں اور اشیاء کے بارے میں جاننے کا شوق ہوتا ہے کہ جو اس سے دور رکھی جاتی ہیں۔ یا جن کے بارے میں اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ پراسرار ہیں۔ اس چھپی ہوئی اور خفیہ دنیا کی تلاش میں اس کا جذبہ تجسس اسے ابھارتا ہے اور وہ انجانی دنیا کو اس کی پراسراریت سے نکال کر حقیقت میں سامنے لاتا رہتا ہے۔

انسان میں تجسس کے اس مادہ کی وجہ سے وہ نئے خیالات و افکار کی تخلیق کرتا ہے یعنی اقدار اور روایات کو چیلنج کرتا ہے اور اس جستجو میں ہوتا ہے کہ ایک نئی دنیا کی تلاش کرے جس میں جدتیں ہوں نئی روایات ہوں' اور نئی شکلوں کے ساتھ حالات کو لایا جائے لیکن جب بھی پرانی اور نئی قدروں کے ساتھ تصادم ہوتا ہے تو ان حالات میں پرانے نظام اور اس کے حامی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگوں میں تجسس کے جذبات کو ختم کر دیا جائے اس سلسلہ میں وہ مذہب کو بھی استعمال کرتے ہیں کہ جس کی بنیاد پر کہا جاتا ہے کہ نئی چیزوں سے پرہیز کیا جائے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ نئی اقدار نظام کو بدلیں گی جس کی وجہ سے پرانے نظام کے مراعات یافتہ لوگ اپنا مرتبہ اور حیثیت کھو دیں گے مذہب کے ساتھ ساتھ سماجی پابندیاں بھی لگائی جاتی ہیں تاکہ لوگ پرانی حدود کو پار نہ کریں۔ یہاں تک کہ ایسے قوانین بھی بنائے جاتے ہیں کہ لوگ معلومات اور علم کی ان حدود سے تجاوز نہ کریں کہ جو قدیم نظام میں بنا دی گئی ہیں۔ اس لئے بائبل میں تجسس اور نئی چیزوں اور باتوں کے جاننے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ "آنکھوں کا لالچ ہے" اور تنبیہہ کی گئی ہے کہ اس علم سے زیادہ جاننے کی کوشش مت کرو جو خدا نے انسان کے لئے ودیعت کر دیا ہے۔ اس لئے جن افراد یا جماعتوں میں تجسس کا مادہ ہوتا ہے اور علم کی ان حدود سے آگے جانا چاہتے ہیں۔ ایسے

لوگوں کو قدامت پرست حلقوں میں باغی کہا جاتا ہے۔

لیکن انسان میں تجسس کا جذبہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ ان تمام مذہبی اور سماجی پابندیوں کے باوجود سائنسدان، مورخ، آرٹسٹ، ادیب و شاعر، ان سب نے مل کر علم کو پھیلانے میں حصہ لیا۔ اور اسے کسی تنگ دائرے میں محدود نہیں رہنے دیا۔ ان کی کاوشوں اور تخلیقات کی وجہ سے علم کے نئے دروازے کھلتے رہے، اور انسانی ذہن وسیع ہوتا رہا۔

ماضی میں عورتوں کو اس بات پر مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا کہ وہ علم کی پابندیوں کو توڑ کر، نئی فکر کی راہیں تلاش کرتی ہیں۔ اس لئے ہمارے مذہبی ادب میں حضرت حوا اس وجہ سے ملزم ٹھہرتی ہیں کہ انہوں نے حضرت آدمؑ میں تجسس کو پیدا کیا اور علم یا جاننے پر جو پابندی تھی اسے توڑا۔ یونانی ادیب پنڈورا کا بھی یہی کردار ہ اور اور انہیں باغی عورتیں کہا جاتا ہے۔ عہد وسطی میں عورتوں کو سماجی سرگرمیوں سے محروم کر کے انہیں پیچھے کی جانب دھکیل دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماج میں عورتیں اب تجسس کا باعث بن گئیں کہ جن کے بارے میں جاننے کا شوق اور جذبہ لوگوں میں پیدا ہو گیا۔ یورپ میں اس دور میں عورتوں کے خلاف ایک زبردست مہم کا آغاز ہوا اور انہیں جادوگرنیاں کہہ کر اذیتیں دی گئی، زندہ جلایا گیا۔ اب مورخ اس پورے عمل کے بارے میں لکھ رہے ہیں کہ درحقیقت عورتوں نے جڑی بوٹیوں کے علم کی وجہ سے طب کے شعبہ میں اہمیت اختیار کر لی تھی۔ مردوں کو ان کا یہ تسلط گوارہ نہیں تھا اس لئے انہیں جادوگرنیاں کہہ کر ان کی سرگرمیوں کو ختم کیا اور ان کے طب کے علم کو بھی ختم کر دیا۔ اس کی وجہ سے سماج میں ان کا رتبہ بھی گر گیا اور علم سے محروم ہو کر وہ مرد کی محتاج ہو گئیں۔

جب یورپ کے لوگ امریکہ پہنچے تو انہوں نے وہاں قبائل کو انسانی تہذیب کے ابتدائی دور میں دیکھا ان کا کلچر اہل یورپ کے لئے پرانا اور قدیم تھا۔ مگر انہیں یہ تجسس ہوا کہ ان کے آباؤ اجداد بھی اسی دور سے گزرے ہوں گے اور ایسی ہی زندگی گزارتے ہوں گے۔ اس جذبہ نے ان میں ماضی کے کلچر اور تہذیبوں کو جاننے کا شوق پیدا کیا۔ اس شوق نے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی جو علم بشریات، یا انتھراپولوجی کہلاتا ہے۔ اس کے ماہرین نے اس علم کی مدد سے قبائل، برادریوں، اور مختلف جماعتوں کے کلچر اور رسم و رواج کا مطالعہ کیا، جس نے ماضی کے بارے میں ہماری معلومات کو بہت زیادہ بڑھایا۔

لوگوں میں تجسس کے جذبہ کو پیدا کرنے میں سیاحوں کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ لوگ جب دوسرے ملکوں کی سیاحت کر کے اپنے ملکوں میں واپس آتے تھے اور اپنے تجربات کو س انداز سے بیان کرتے تھے کہ لوگوں میں دوسرے ملکوں اور ان کے لوگوں کے بارے میں جاننے اور معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال مارکو پولو کی ہے کہ جس نے یورپ میں اس قصہ کو پھیلایا کہ الموت کے قلعہ میں اسماعیلی فرقہ کے حکمرانوں نے ایک جنت بنا رکھی تھی، اور جو فدائیں اپنی مہم میں کامیاب ہو جاتے تھے انہیں اس جنت کی سیر کرائی جاتی تھی۔ حالانکہ جب مارکو پولو یہاں سے گزرا ہے اس سے پہلے ہی 1256 میں ہلاکو خاں قلعہ کو فتح کر کے اسے تہس نہس کر چکا تھا۔ اب تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جنت کے بارے میں یہ محض قصے و کہانیاں تھیں حقیقت میں ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں۔ لیکن مارکو پولو نے اپنے قارئین کو متاثر کرنے کے لئے اپنے سفرنامے میں ایسی ایسی باتیں لکھی ہیں کہ جنہیں عقل تسلیم کرنے میں تیار نہیں۔ مگر اس وقت کے لوگ ان پر یقین ہی کرتے تھے اور ان میں ان کے بارے میں تجسس بھی پیدا ہوتا تھا۔

سیاحوں کے علاوہ داستان گو، جب لوگوں کے مجمع میں داستانیں اور کہانیاں بیان کرتے اور غیر ملکوں کے بارے میں بعض حقیقی اور بعض فرضی باتیں بتاتے تو اس سے بھی ان میں دوسروں کے بارے میں جاننے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ مسلم دنیا میں ''سند باد جہازی'' کے قصے بڑے ذوق و وق سے سنے جاتے تھے۔ تاجر دوسرے ملکوں سے کئی قسم کی اشیا لاتے تھے۔ وہ چیزیں کہ جن کی مارکیٹ میں مانگ ہوتی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی وہ غیر ملکوں سے ایسی نایاب اشیاء بھی لاتے تھے کہ جن کے بارے میں لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا تھا۔ ان اشیاء کے خریدار بادشاہ اور امراء ہوا کرتے تھے۔ وہ اس لئے ان کو خریدتے تھے تاکہ اس سے ان کی شہرت اور مرتبہ میں اضافہ ہو اور لوگوں میں یہ احساس ہو کہ ان کے پاس نایاب شیاء ہیں۔

جب ماہر آثار قدیمہ نے پرانی تہذیبوں کو دریافت کرنا شروع کیا، تو ان کی ئی کے دوران نایاب اور قیمتی اشیاء ملیں۔ ان کی مدد سے مورخوں نے اس عہد کی یب اور ان کی سماجی زندگی کے بارے میں تحقیق کی۔ اب ان اشیاء کو دنیا کے مختلف

میوزموں میں رکھا گیا ہے تاکہ لوگ انہیں دیکھ کر قدیم تہذیبوں کے بارمیں آگہی حاصل کر سکیں۔ سب سے پہلا میوزیم اٹلی میں 1581 میں قائم ہوا۔ اس کے بعد پوپ کے شہر ویٹکن سٹی میں 1740 میں قدیم اشیاء کے لئے میوزیم کی تعمیر ہوئی۔ 1753 میں برٹش میوزیم کی ابتداء ہوئی۔ اب تقریباً دنیا کے ہر ملک اور ہر بڑے شہر میں میوزیم ہیں کہ جن میں قدیم اشیاء کو عہد وار ترتیب سے رکھا جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں میں تجسس کا مادہ ایک شوق کی وجہ بھی بن جاتا ہے۔ اور یہ لوگ اپنے اس شوق کی وجہ سے نایاب اشیاء کو جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ پرانے مسودں کو جمع کرتے ہیں، کچھ سکوں کو، کچھ ڈاک ٹکٹوں کو اور کچھ ہتھیاروں کو۔ اس وجہ سے جن افراد کے پاس نایاب اشیاء ہوتی ہیں، ان اشیاء کا علم بھی ان کو ہوتا ہے اور اس علم کی وجہ سے ان کا شمار ماہرین میں ہونے لگتا ہے۔ اب دوسرے لوگوں کو جب بھی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

تاریخ اس حقیقت کو ہمارے سامنے لاتی ہے کہ تجسس کے نتیجہ میں افراد اور قوموں میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہوتا، نامعلوم دنیا کے رازوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اور اسی تحقیق کے نتیجہ میں سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی ہوتی ہے۔ انسانی ذہن کو سمجھا جاتا ہے اور نئے خیالات نئی روح اور نئی تازگی دیتے ہیں۔

تاریخ اور جعل سازی

تاریخ میں جعل سازی کی روایت بہت پرانی ہے، یہ جعل سازی ہر اس چیز میں ہوتی تھی کہ جس میں فائدہ ہوتا تھا۔ لیکن جعل سازی کے لئے ضروری تھا کہ جعل ساز اپنے فن میں ماہر ہو، اور ایسی جعلی چیز بنائے کہ جو اصلی معلوم ہو اور لوگ دھوکا کھا جائیں۔ اس کی ابتداء ہم سکّوں کی جعل سازی میں دیکھتے ہیں، کیونکہ اس سے فوری فائدہ ہوتا تھا، چونکہ ابتداء میں عمدہ سانچے موجود نہیں تھے، اس لئے جعلی سکّے بنانا آسان تھا، خاص طور سے سونے اور چاندی کے سکّے کے جن میں ملاوٹ کی جاتی تھی، اور اصلی کے مقابلے میں کم قیمت پر تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال سلطان محمد بن تغلق کے دور کی ہے کہ جب اس نے تانبے کے سکّے جاری کئے، اور ان کی قدر سونے و چاندی کے برابر رکھی، تو سناروں اور دوسرے جعل سازوں نے اتنی تعداد میں سکّے بنانا شروع کئے کہ مارکیٹ میں اس کی قدر و قیمت گر گئی، اس لئے سلطان نے تنگ آ کر یہ سکّے واپس لئے اور ان کے بدلے میں لوگوں کو قیمت ادا کی۔

چونکہ موجودہ زمانے میں تاریخی اشیاء کی مانگ بڑھ گئی ہے، اس لئے جعل سازوں نے قدیم مجسمے، ظروف اور ہتھیار بنا کر انہیں سیاحوں کے ہاتھوں بیچنا شروع کر دیا۔ اب چونکہ ایسے ماہرین موجود ہیں کہ جو اصلی اور نقلی کی شناخت کر لیتے ہیں، اس لئے میوزیم جب ان تاریخی اشیاء کو خریدتا ہے تو پہلے اس کی تحقیق کر لیتا ہے۔ لیکن عام لوگ اکثر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہی صورت حال مصوروں کی تصاویر کی ہے۔ مشہور مصوروں کی پینٹنگز کی نقلیں، اصل کر کے فروخت ہوئیں۔ مگر اب نئے آرٹسٹ مشہور مصوروں کی نقلیں تیار کر کے، مارکیٹ میں بیچتے ہیں اور لوگ انہیں گھروں میں خوبصورتی کے لئے آویزاں کرتے ہیں۔

جعل سازی کی یہ روایت سرکاری دستاویزات میں بھی جاری رہی ہے۔ سرکاری فرامین، خطوط اور عہد ناموں کو تبدیل کیا جاتا رہا ہے، یہاں تک کہ برطانوی پارلیمنٹ کی کارروائی کو بھی ضرورت کے تحت بدل دیا گیا ہے۔ روبرٹ کلائیو نے جب میر جعفر اور سیٹھ رمی چند سے معاہدہ کیا، تو اس پر اس کے ساتھی واٹسن نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تو کلائیو نے اس کے دستخط خود کر دیئے، چونکہ شروع سے اس کا ارادہ اس پر عمل کرنے کا نہیں تھا۔

جعل سازی صرف سکوں اور دستاویزات تک محدود نہیں رہی، بلکہ ہر دور میں یہ بھی ہوا ہے کہ کچھ افراد نے شہزادے، یا راجہ، مہاراجہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ خاص طور سے یہ اس وقت ہوا کہ جب اصلی شہزادہ یا تخت کا دعویدار غائب ہو گیا، تو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی نے یہ دعویٰ کر دیا۔ تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ان جعلی دعویداروں نے تخت و تاج یا جائیداد کے لئے اپنے دعوے پیش کئے۔

جعل سازی کا یہ سلسلہ ادب میں بھی جاری رہا، اور بہت سی مثالوں میں سے ایک فردوسی کی وہ مشہور ہجو ہے کہ جو اس نے محمود غزنوی کے بارے میں کہی۔ اب محققین کی یہ رائے ہے کہ یہ اس کی لکھی ہوئی نہیں ہے، بعد میں اسے شامل کیا گیا ہے۔ مگر اس ہجو سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ اس وقت یا بعد میں لوگ محمود غزنوی کے بارے میں کیا تاثرات رکھتے تھے۔

جعل سازی تبرکات میں خوب ہوتی ہے۔ ہر مذہب میں تبرکات کی اہمیت ہوتی ہے، جن کی زیارت کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں، لوگوں کے ان جذبات کا فائدہ اٹھا کر جعل ساز، جعلی تبرکات تیار کر کے ان کے ذریعہ دولت کماتے ہیں، اس کی مثالیں بدھ مذہب، عیسائیت اور ہمارے ہاں موجود ہیں۔

فارسی اور اردو ادب میں، خاص طور سے شاعری کے فن میں یہ روایت تھی کہ آنے والے شعراء جب کسی ایک شاعر سے متاثر ہوتے تھے تو اس کی طرز میں کلام کہہ کر، اسی کے نام سے موسوم کر دیتے تھے۔ یہ ''الحاقی کلام'' کہلاتا ہے۔ اس روایت نے جدید محققین کے لئے تحقیق کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ وہ اس الحاقی کلام اور اصلی کلام کا موازنہ کرتے ہوئے زبان کے استعمال، اور مروجہ الفاظ اور اصطلاحوں کے ذریعہ فیصلہ کرتے ہیں کہ کون سا

اصلی ہے اور کون سا الحاقی۔ یہ بات تقریباً اکثر کلاسیکل اور لوک شعراء کے کلام میں ہے۔

ادب کے علاوہ تاریخ میں بھی جعل سازی کی مثالیں مل جاتی ہیں، مثلاً کسی نے جہاں گیر کی ''تزک'' یا ''آپ بیتی لکھ ڈالی''۔ اب ہمارے پاس جہاں گیر کی اپنی تزک ہے، اور دوسری جعلی۔ مگر مورخوں کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ جعلی تزک بھی اس عہد کی لکھی ہوئی ہے، اس لئے اس میں بھی ایسا تاریخی مواد ہے کہ جس کو قبول کیا جا سکتا ہے، لہٰذا یہ دونوں کتابیں اب تاریخ کا ماخذ ہیں۔

جعل سازی کا یہ سلسلہ جدید دور میں بھی رکا نہیں، حالانکہ اب جعل سازی کو آسانی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس فن کے ایسے ماہرین موجود ہیں کہ جو آج بھی لوگوں کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، مثلاً کچھ عرصہ ہوا کہ ایک شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے ہٹلر کی ڈائری کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ ایک ایسی سنسنی خیز دریافت تھی کہ اس نے نہ صرف جرمنی، بلکہ یورپ کے دوسرے ملکوں کو بھی حیران کر دیا۔ جرمنی کے مشہور رسالے اسٹرن (Stern) نے اس کے حقوق، مہنگے داموں خرید لئے۔ لیکن جب ماہرین نے اس کی تحریر اور لکھی جانے والی سیاہی کا تجزیہ کیا تو ثابت ہوا کہ یہ ابھی لکھی گئی ہے۔ جلد ہی یہ راز فاش ہوا اور ڈائری کی دریافت سے جو تجسّس پیدا ہوا تھا، جلد ہی ختم ہو گیا۔

اسی زمانے میں، ہٹلر کی ڈائری اور اس کی دریافت سے متاثر ہو کر ضیاء الحق کے زمانے میں ہماری نوکر شاہی نے قائداعظم محمد علی جناح کی ایک ڈائری دریافت کر لی۔ اس میں خاص طور سے یہ نصیحت کی گئی تھی کہ پاکستان میں صدارتی طرزِ حکومت قائم ہونا چاہئے۔ چونکہ ضیاء الحق صدر تھے، لہٰذا انہیں اس ڈائری اور بانیء پاکستان کے اس تصور سے تقویت ملتی تھی، لہٰذا اس کا خوب زور شور سے پروپیگنڈا کیا گیا۔ مگر یہ سارا پروپیگنڈا اس وقت سرد پڑ گیا کہ جب جناح صاحب کے سیکرٹری جناب خورشید نے کہا کہ قائداعظم نے نہ تو ایسی ڈائری لکھی، اور نہ ہی اس کا کوئی وجود ہے۔ لہٰذا یہ ڈائری بھی، ہٹلر کی ڈائری کی طرح بہت جلد گمنامی میں چلی گئی۔

سوال یہ ہے کہ کیا جعل سازی کا یہ سلسلہ جو سکّوں، تبرکات، تاریخی اشیاء، آرٹ، ادب و شاعری میں جاری رہا ہے، کیا یہ جاری رہے گا یا اس کے ختم ہونے کے

امکانات ہیں؟ یہ سلسلہ اس لئے جاری رہے گا کیونکہ مارکیٹ میں ان اشیاء کی ضرورت ہے، چونکہ اصلی اشیاء اس مانگ کو پورا نہیں کرسکتیں، اس لئے نقلی یا جعلی ان کی جگہ لیتی رہیں گی۔ جعل سازوں، اور ان ماہرین میں جو ان کے فریب کو سامنے لاتے ہیں، ان دونوں کے درمیان مقابلہ جاری رہے گا۔

تاریخ اور تاجر

تاریخ میں جو جماعتیں اور لوگ تبدیلی لے کر آتے ہیں، ان میں اب تک حکمرانوں، امراء، دانشوروں اور فلسفیوں کا ذکر تو ہوتا ہے، مگر تاجروں کے تاریخی کردار کو فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اب مورخوں نے اس طرف توجہ دی ہے کہ تاجر، خاص طور سے وہ تاجر کہ جنہوں نے دوسرے ملکوں سے تجارت کی، انہوں نے کس طرح تہذیبی، تجارتی، اور ذہنی طور پر دنیا کو تبدیل کرنے میں مدد دی۔

دنیا کی تہذیب میں تاجروں کا طبقہ، اس وقت وجود میں آیا کہ جب زرعی سماجوں میں ضرورت سے زائد پیداوار ہونے لگی، اس کے ساتھ ہی تہذیب و تمدن میں ترقی ہوئی، تو تاجروں نے اس مرحلہ پر سماج میں اہم کردار ادا کیا، انہوں نے اس سامان اور اشیاء کو کہ جو ان کے پاس زائد تھیں، ان کے بدلے میں دوسرے ملکوں سے وہ اشیاء برآمد کرنی شروع کیں کہ جس کی مانگ ان کے ہاں تھی۔ اس ضرورت نے انسانی تہذیب میں کئی انقلابی تبدیلیاں کیں، مثلاً تجارت کے بری اور بحری راستے دریافت ہوئے، سفر کے لئے سامان کو محفوظ طریقے سے لے جانے کے لئے ذرائع کو تلاش کیا گیا۔ بحری سفر کے لئے کشتیاں اور جہاز بنائے گئے، بری سفر کے لئے کاروان کی ابتداء ہوئی تاکہ تاجر حفاظتی قافلوں کے ذریعہ سامان لے کر جائیں۔ راستے میں تاجروں کی سہولت کے لئے مسافر خانے اور بھٹیار خانے بنائے جانے لگے۔ تاجر صرف سامان تجارت ہی ایک ملک سے دوسرے ملک نہیں لاتے تھے، بلکہ یہ دوسری تہذیبوں، روایات، اور زبانوں کو بھی ساتھ میں لاتے تھے جس سے کلچرل روابط کا آغاز ہوا، اور تہذیبوں کے درمیان اشتراک عمل کا یہ سلسلہ شروع ہوا، جس کی وجہ سے ہر تہذیب نے ایک دوسرے سے سیکھا۔

لیکن قدیم تہذیبوں میں تاجروں کی عزت نہیں کی جاتی تھی، اور سماج میں ان کا

رتبہ کم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زراعتی معاشرے میں کہ جہاں ہر فرد محنت و مزدوری کے پیداواری عمل میں حصہ لیتا تھا، وہاں تاجروں کے بارے میں یہ خیال تھا کہ یہ بغیر محنت کے منافع کماتے ہیں، اس لئے لوگ انہیں حقارت سے دیکھتے تھے، اور عام تاثر یہ تھا کہ یہ لوٹ مار کرنے والے اور لوگوں کو ٹھگنے والے ہیں، قدیم یونان میں ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں تھی۔ افلاطون نے ان کے بارے میں کہا کہ یہ ایسا منافع کماتے ہیں کہ جس کی بنیاد نیکی اور پاکیزگی پر نہیں ہے۔

یورپ میں عہد وسطیٰ میں چور، لٹیرے، اور تاجر ایک ہی پیر کے مرید تھے، جو سینٹ نکولس کہلاتا تھا، اس لئے یہ ستم ظریفی کی بات تھی کہ ان کے پاس دولت تھی، مگر سماجی طور پر ان کا مقام باعزت نہیں تھا، یورپ ہی میں کہ جہاں عیسائیت کی وجہ سے سودی کاروبار ممنوع تھا، اس کے لئے عیسائی تاجروں کی جگہ یہودی تاجروں کو خاص طور سے یورپ کے مختلف شہروں میں آباد کیا گیا تاکہ وہ یہ کاروبار کرسکیں۔

موجودہ دور میں تاجروں کے بارے میں جو تعصّبات تھے، مورخوں نے ان کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے کارناموں کو بیان کیا ہے۔ منافع کی خواہش میں تاجر دور دراز کا سفر کرتے تھے، راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے، ڈاکوؤں سے بچتے بچاتے اپنا سامان حفاظت سے لے جاتے تھے۔ قدیم اور عہد وسطیٰ میں تاجروں کی بستیاں دوسرے ملکوں میں آباد تھیں۔ مثلاً عرب تاجر سری لنکا اور چین میں آباد تھے۔ ان کی بستیاں جنوبی ہندوستان میں تھیں کہ جہاں یہ پرامن طریقے سے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر تاجروں نے مقامی عورتوں سے شادیاں کرلیں، ان کے بچے ''موپلہ'' کہلائے، اب تک جنوبی ہندوستان میں مسلمان موپلہ موجود ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے حکمرانوں نے ان عرب تاجروں کو خوش آمدید کہا کیونکہ ان کی آمد اور ان کی وجہ سے تجارت میں ہونے والے منافع میں ان کا بھی حصہ تھا۔ پندرہویں صدی تک بحر روم اور بحر ہند پر عرب تاجروں کا قبضہ تھا، اس وجہ سے ہندوستان و چین سے ان کے تجارتی رابطے تھے۔

یورپ میں اٹلی کے تاجروں نے بڑی ترقی کی، ان میں وینس، فلورینس اور جنوا کی ریاستیں تھیں، ان تاجروں نے یورپ اور ایشیا کی تجارت سے اس قدر کمایا کہ یہ شہر

تہذیب وثقافت اور علم وادب کے مرکز بن گئے۔ تجارتی راستوں کی حفاظت، اور تجارتی فوائد کے لئے ان تاجروں نے صلیبی جنگوں میں سرمایہ کاری بھی کی تھی۔

پندرہویں صدی میں جب پرتگالی بحرروم میں داخل ہوئے، اوراس کے سمندری راستوں پر قبضہ کیا تو عربوں کا تجارتی تسلط ختم ہوگیا، پرتگالیوں کے بعد ڈچ، فرانسیسی، اور انگریز تاجر آئے۔ انہوں نے نہ صرف ایشیا وافریقہ کے ملکوں سے تجارت کی، بلکہ اپنے تجارتی مال کی حفاظت کے لئے فوج بھی رکھنا شروع کردی۔ ان کے جہاز میں تجارتی مال کے ساتھ ساتھ فوجی بھی ہوتے تھے تاکہ حریف یورپی طاقتوں اور سمندری لٹیروں سے خود کو محفوظ رکھیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان سے تجارت شروع کی، تو یہاں کے اہم شہروں میں انہوں نے اپنی تجارتی کوٹھیاں تعمیر کرائیں جو قلعہ نما ہوتی تھیں اور جن کی حفاظت کے لئے یہ فوج رکھتے تھے۔ آگے چل کر اسی فوج کی مدد سے انہوں نے ہندوستان کی خانہ جنگیوں میں حصہ لیا اور تجارت سے یہ سیاست کی جانب آئے، اور رفتہ رفتہ ہندوستان پر قابض ہوگئے۔

تاجروں کے بارے میں سماج کا رویہ اس وقت بدلنا شروع ہوا کہ جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا، اس نے تجارت میں یہ تبدیلی کی کہ اب تک تاجر، جن کا دستور تھا کہ سستا مال ایک جگہ سے خرید کر دوسری جگہ جہاں اس کی مانگ ہوتی تھی وہاں مہنگا فروخت کرتے تھے۔ صنعتی انقلاب نے اس عمل کو روک دیا۔ اب یورپ میں فیکٹریاں قائم ہونا شروع ہوئیں کہ جہاں مال بنایا جاتا تھا، اوراس بنے بنائے مال کو اب دوسرے ملکوں میں کھپایا جاتا تھا۔ اس لئے تاجروں کو اب نئی نئی منڈیوں کی تلاش ہوئی۔

چونکہ تجارت پر ریاست کا کنٹرول تھا، کسٹم ڈیوٹی، ٹیکس، قیمتوں کے تعین کی وجہ سے تاجروں نے اب اس پر غور کیا کہ انہیں سیاست پر بھی کنٹرول کرنا ضروری ہے تاکہ سیاسی اداروں کی مدد سے وہ اپنی مراعات اور سہولتوں کو بچاسکیں۔ اس وقت تمام ترقی یافتہ ملکوں میں بڑے بڑے تاجر اوران کی کمپنیاں سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کو فنڈ مہیا کرتی ہیں، اس کے بدلے میں یہ سیاستداں ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔

امریکہ اور یورپ کے تاجروں کی یہ خصوصیت ہے کہ جہاں وہ استحصال اور کرپشن کے ذریعہ دولت کماتے ہیں، تو دوسری طرف وہ اس دولت کو یونیورسٹیوں، تحقیقی اداروں، لائبریریوں، اور فلاحی اداروں کے قیام میں خرچ بھی کرتے ہیں، اور اس کے عوض تاریخ میں نیک نامی حاصل کرتے ہیں۔

شاندار ماضی

جب ہم تاریخ میں شاندار ماضی یا سنہری دور کا ذکر کرتے ہیں، تو اس سے ہماری مراد ایک ایسے زمانے سے ہوتی ہے کہ جس میں تمام لوگ خوش حال رہے ہوں، اور ان کی زندگی، فکر، رنج والم، یا محرومیوں سے دور ہو۔ اس تعریف کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ میں کبھی ایسا زمانہ یا دور رہا ہوگا؟

اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم کیوں ماضی میں شاندار اور سنہری زمانے کو تلاش کرتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب ہم اپنے زمانے سے مایوس ہوتے ہیں، اور حال کے مسائل کا کوئی حل نہیں دیکھتے ہیں، تو اس صورت میں نفسیاتی طور پر ہم ماضی میں پناہ لے کر وہاں شاندار اور سنہری زمانے کی تصویر تیار کرتے ہیں، اور حال کے مقابلہ میں ماضی کی شان وشوکت میں خود کو گم کر لیتے ہیں۔

اس نفسیاتی کیفیت سے سیاستداں اور حکمراں طبقے فائدہ اٹھاتے ہیں، جو شاندار ماضی کی تصویر کشی کر کے لوگوں کو ترقی کے بجائے واپس قدامت پرستی کی جانب لے جانا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جب بھی شاندار ماضی کی بات کی جائے گی اور کہا جائے گا کہ ہمارا ماضی اس لئے شاندار تھا کہ ہماری قدیم روایات، قدریں، اور رسم ورواج شاندار تھے، اس لئے انہیں دوبارہ سے واپس لانا چاہئے تاکہ ہم واپس جا کر پھر اس درخشاں زمانے کو حاصل کر لیں۔ اسی ذہنی کیفیت کے نتیجہ میں احیاء کی تحریکیں اٹھتی ہیں اور یہی پرانی رسومات کو دوبارہ سے نئی زندگی دینے کا باعث ہوتی ہے۔

جب ہم شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہیں، تو دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ ہم کس تناظر میں کسی زمانے یا عہد کو شاندار کہہ رہے ہیں؟ مثلاً اگر عباسیہ دور، شاندار اور سنہری دور تھا تو کیا وہ اپنے ہم عصر عہد کی دوسری سلطنتوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ تھا؟ اگر اس کا مقابلہ یورپ میں کارونجین سلطنت کہ جس کا سب سے طاقت ور بادشاہ شارلیمن تھا، اس سے کیا جا

سکتا ہے، یا کیا یہ عہد بازنطینی سلطنت سے زیادہ شاندار تھا؟ اس کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں تاریخی شواہد کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ اہل یورپ شارلیمن کے دور حکومت کو شاندار سمجھتے ہیں، تو بازنطینی اپنے کارنامے بیان کرتے ہیں۔ اس لئے کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں کئی شاندار ماضی ہوں، اور ہر قوم اپنی عظمت کو ان شاندار ادوار میں ڈھونڈتی ہو۔

دوسری وجہ ماضی کو شاندار بتانے کی اس وقت آتی ہے کہ جب ہم اس کا مقابلہ حال سے کرتے ہیں۔ زمانہ حال ہمارے سامنے ہوتا ہے، ہم اس میں رہ رہے ہوتے ہیں، اس کے مسائل ہمارے سامنے ہوتے ہیں، اس لئے ہم اس سے بیزار ہوتے ہیں۔ جب کہ ماضی ہم سے دور ہوتا ہے، اس کے مسائل جو روزمرّہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں، وہ روپوش ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے یہ دوری ماضی کی برائیوں کو گم کر دیتی، اور ہم اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہمارا ماضی حال سے بہتر تھا۔

اگر شاندار ماضی کا مزید تجزیہ کیا جائے تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو عام طور سے وہ ماضی اپیل کرتا ہے کہ جس میں فتوحات ہوں، اور جس میں ایسے ہیروز ابھر کر آئیں کہ جن کی بہادری اور شجاعت سے لوگوں کے دلوں کو گرمایا جا سکے۔ اس قسم کا شاندار ماضی تاریخی ناولوں، اور شاعروں کے ہاں ملتا ہے۔ اگر آپ نے عبدالحلیم شرؔر، صادق صدیقی سردھنوی اور نسیم حجازی کے ناول پڑھے ہوں تو آپ کو فتوحات کا یہ شاندار ماضی، پوری آب و تاب سے نظر آئے گا، اور اسی ماضی کی تشکیل اقبال کے ہاں بھی ہے:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ان کے ہاں غازیوں اور جنگ جوؤں کا شاندار زمانہ ہے کہ لوگوں کو ماضی کی شاندار یادوں میں گم کر دیتا ہے۔

جب ماضی کی تشکیل ان بنیادوں پر کی جاتی ہے، تو اس سے لوگوں میں جنگ جوئی، اور بہادری و شجاعت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور وہ امید کرتے ہیں کہ ان کی مدد سے وہ دوبارہ سے ماضی کی عظمت اور اس کی شان و شوکت کو حاصل کر لیں گے۔ اس کے مقابلہ میں شاندار ماضی کا ایک دوسرا تصور ہے کہ جس کی تشکیل جنگ و جدل اور فتوحات پر نہیں ہوتی ہے،

بلکہ اس میں اس بات کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے کہ ایک عہد میں علم وادب، سائنس، اور فلسفہ کی تخلیق ہوئی، نئے خیالات وافکار پیدا ہوئے کہ جنہوں نے لوگوں میں ذہنی شعور پیدا کیا۔

ان دو شاندار ماضیوں میں ہم علم وادب اور فلسفیانہ ماضی کے بجائے، فتوحات اور جنگ وجدل کے ماضی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کی واپسی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

جب تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہم پر یہ بات صاف طور پر واضح ہو کر آتی ہے کہ ہر دور اور زمانے میں شاندار کا تصور جدا جدا رہا ہے۔ مثلاً حکمرانوں، امراء اور طبقہ اعلیٰ کے لوگوں کے لئے ان کا زمانہ شاندار ہوتا ہے، کیونکہ ان کے پاس دولت واقتدار ہوتا ہے، اس لئے ان کی زندگی میں خوشی ومسرت، اطمینان اور مراعات ہوتی ہیں، جب کہ عام لوگ، جن میں کسان، ہنرمند، دستکار، خانہ بدوش، غلام اور مزدور ہوتے ہیں، یہ ہر دور میں غربت، مفلسی اور محرومیوں کا شکار رہے ہیں ان کے لئے ان کے اپنے عہد کی شان و شوکت، اور عظمت بے معنی ہوتی ہے۔ ہر دور میں ہم ایک طرف شاندار حویلیاں اور محلات دیکھتے ہیں، تو دوسری جانب جھونپڑیاں اور کچے مکانات، ایک طرف انواع واقسام کے کھانے اور دعوتیں ہوتی ہیں تو دوسری جانب بھوک اور فاقہ، ایک طرف ریشم ومخمل کے ملبوسات ہوتے ہیں، تو دوسری جانب مشکل سے تن ڈھانپنے کو کپڑا۔ ایک طرف خدمت کے لئے ملازمین کی فوج ہوتی ہے، تو دوسری جانب محنت ومشقت کی زندگی، ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ حکمران اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے جاتے ہیں کیونکہ ان کے مقبرے اور یادگاریں انہیں تاریخ میں زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، جب کہ عام لوگ اس دنیا سے خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔

اس لئے جب سیاستدان، شاندار ماضی کے نام پر لوگوں کے جذبات کو ابھارتے ہیں، اور دعوے کرتے ہیں کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد اس ماضی کا احیاء کریں گے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سے شاندار ماضی کا؟ حکمرانوں، اور امراء کے شاندار ماضی کا، یا عوام کے گمنام اور خاموشی ماضی کا؟

دیکھا جائے تو تاریخ میں کوئی شاندار ماضی نہیں ہوتا ہے۔ ماضی کو شاندار بنانے کا کام مورخ کرتے ہیں جو خاص مقاصد کے تحت اس کی تشکیل کرتے ہیں، اور لوگوں کو ایک دلکش دنیا میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں۔

تاریخ: ماضی/ حال کی روشنی میں

اکثر کہا جاتا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ اس لئے ضروری ہے کیونکہ ماضی کے واقعات کی روشنی میں ہم زمانہ حال کو بہتر طریقہ سے سمجھ سکیں گے۔ایک حد تک یہ بات صحیح ہے کیونکہ تاریخ میں ہزار ہا واقعات ہیں کہ جو ایک خاص رجحان، اور سماجی و سیاسی یا معاشی پہلو کی عکاسی کرتے ہیں یہ واقعات تاریخ کے صفحات پر رہتے ہیں۔ان میں اچانک یا کبھی شعوری طور پر کوئی ایک واقعہ زمانہ حال کے لئے اہم ہو جاتا ہے تو اسے تاریخ کے صفحات سے نکال کر باہر لایا جاتا ہے اسے دوبارہ سے بیان کیا جاتا ہے اور اس کو بطور ماڈل پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس کی روشنی میں فائدہ اٹھا سکیں۔ جب اس واقعہ کے ذریعہ مفادات پورے ہو جاتے ہیں اور اس کی ضرورت نہیں رہتی ہے تو وہ دوبارہ سے فراموش کر دیا جاتا ہے اور اسے تاریخ کے صفحات پر محفوظ کر دیا جاتا ہے۔

مثلاً جب ہندوستان میں 1920 کی دہائی میں فرقہ واریت کے تحت ضرورت پڑی تو مورخوں نے تاریخ کے محمد بن قاسم، محمود غزنوی، اور محمد غوری کو بطور ہیرو بنا کر پیش کر دیا۔ جب علماء سیاست میں آئے تو انہوں نے احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید کو دوبارہ سے زندہ کر دیا اور ان کے کارناموں کی تفصیلات بیان کر دیں۔

ہندوستان میں چونکہ جمہوریت ہے اور وہاں سیکولر سماج میں کثیر المذہبی اور ثقافتی رجحانات ہیں اس لئے ان کے ہاں اکبر اور اس کی صلح کل کی پالیسی کو اجاگر کیا جاتا ہے اور اس کا دورِ حکومت ان کے لئے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن پاکستان میں کہ جو ایک نظریاتی ملک ہے وہاں اکبر اور اس کی صلح کل کی ضرورت نہیں۔ اس لئے یہاں شیخ احمد سرہندی کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے کہ جو دو قومی نظریہ کے بانی بن گئے ہیں۔

اسی طرح تاریخ میں سنہری دور کا تصور ہے کہ جو کولونیل ازم سے آزادی کے

وقت اور مغرب کی بالادستی کے وقت ابھرا۔ ہندوؤں میں یہ سنہری دور "رام راج" ہے کہ جس کے عہد میں ہندوستان خوش شکل اور پرامن ملک تھا سیاستداں کولونیل دور سے نجات پا کر ہندوستان میں دوبارہ سے رام راج قائم کرنا چاہتے تھے۔

مسلمانوں میں جب مغرب کی برتری کا احساس ہوتا ہے اور موجودہ حالات میں اپنی کم تری اور کم مائیگی کا تو وہ اپنا سنہری دور کبھی عہد عباسیہ میں تلاش کرتے ہیں اور کبھی اسپین میں۔ تاریخ میں یہ ماڈل انہیں موجودہ حال کے بحرانوں سے نکال کر نفسیاتی سکون دیتے ہیں۔

جب یورپ میں جمہوری تحریکیں اٹھیں اور مظلوم طبقوں نے احتجاج شروع کیا تو انہوں نے بھی تاریخ سے اپنے ماڈل اور ہیروز کو نکالا، خاص طور سے اسپارٹاکس ان کا ہیرو بن گیا کہ جس نے رومی ایمپائر کے خلاف غلاموں کو بغاوت پر اکسایا تھا۔ اگرچہ یہ بغاوت کچل دی گئی اور اسپارٹاکس کو اس کے بیس ہزار باغیوں سمیت مصلوب کر دیا گیا۔ مگر ایک طاقتور ایمپائر کے خلاف بغاوت مظلوم طبقوں کے لئے مسرت کا پیغام لائی۔

اس لئے تاریخ میں ایسے واقعات کہ جن کی حال کی سیاست کے لئے اہمیت ہوتی ہے بار بار ابھرتے ہیں اور اپنا کردار ادا کر کے واپس تاریخ میں چلے جاتے ہیں۔

لیکن تاریخ کو سمجھنے کے لئے صرف ماضی کے واقعات ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ جیسا کہ فرانسیسی مفکر اور مورخ مائیکل فوکو نے کہا ہے کہ حال کے واقعات کو دیکھ کر اور سمجھ کر ماضی اور زیادہ سمجھ میں آتی ہے یہ بات اس نے یورپ اور امریکہ میں جیلوں میں قیدیوں کی بغاوت اور احتجاج کے مطالعہ سے کی اور پھر اس کے بعد یورپ میں سزاؤں اور جیلوں کی تاریخ لکھی۔

آج بھی جب ہم لوگوں کے مظاہرے دیکھتے ہیں کہ جب وہ غصہ کی حالت میں عمارتوں کو جلاتے ہیں لوٹ مار کرتے ہیں۔ عوام دشمنوں کو مارتے ہیں۔ تو ان کے جذبات اور اشتعال کو دیکھتے ہوئے 1789 کا فرانسیسی انقلاب یاد آتا ہے کہ جس میں عوام بھی اس طرح مفلسی، غربت، ناانصافی اور امراء کی رعونت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

آج جب ہم جنگ کی تباہ کاریاں دیکھتے ہیں تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماضی

میں کہ جب جنگ اس قدر ہولناک نہیں تھی تو عام لوگ کس طرح اس سے متاثر ہوتے تھے
ان کی جان مال اورعزت محفوظ نہیں تھی۔ پہلے لوگ جنگوں میں رومیوں اور منگولوں کے مظالم
کا تذکرہ کرتے تھے، چنگیز خان و ہلا کو خاں اس کی علامت تھے، مگر اب جنگ کی تباہی اس
قدر بڑھ گئی ہے کہ ان کے مظالم ماند پڑ گئے ہیں۔ اس لئے اب لوگ ہیروشیما اور ناگاساکی
کی بات کرتے ہیں۔

اگر افغانستان اور صوبہ سرحد میں طالبان کی شریعت کا جائزہ لیا جائے تو سید احمد
شہید اور ان کے مجاہدین کی تاریخ کا مطالعہ کرلیں۔ انہوں نے بھی سرحد میں جب شریعت کا
نفاذ کیا تو ان کا طریقۂ کار بھی یہی تھا جو آج طالبان کا ہے۔ وہ بھی اسی طرح سے کوڑے مار
مار کر لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے اور اسی طرح سے موسیقی اور کھیل کود کے دشمن تھے۔

اس لئے تاریخ کو سمجھنے کے لئے جہاں ماضی کا مطالعہ ضروری ہے وہاں حال کے
واقعات بھی اس طرح کے ماضی سمجھنے کا شعور اور آگہی دیتے ہیں۔

ہمیں اپنی تاریخ کہاں سے شروع کرنی چاہئے؟

کافی عرصہ سے پاکستان میں اس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ کہاں سے شروع کرنی چاہئے؟ کیا قدیم برصغیر ہندوستان کا ماضی ہماری تاریخ کا حصہ ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اس صورت میں ہم اپنی تاریخ کی ابتداء عربوں کی فتح سندھ (12-711) سے کرنی چاہئے۔ اس نقطہ ءنظر کے حامی تاریخ کو بھی مذہب سے جوڑ کر، اسے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا تاریخ اس طرح سے تقسیم ہو سکتی ہے؟

اس سلسلہ میں یہ پہلی بات تو یہ ہے کہ تاریخ کا تعلق کسی مذہب اور عقیدہ سے نہیں ہوتا ہے، یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جس میں تہذیبیں ابھرتی ہیں، اور روپوش ہو جاتی ہیں، مذہبی عقیدے آتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، روایات و اقدار بنتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں، تاریخ اس عمل کو اپنے حافظہ میں محفوظ کر لیتی ہے۔ لہٰذا اس میں تہذیبوں، مذہبوں، اور اقوام کے حالات اور ان کا اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ تاریخ کے عمل میں تسلسل بھی ہے اور رکاوٹیں بھی، جب تسلسل ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں تاریخی شعور بھی ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس لئے اب مورخ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں جہاں اس تسلسل میں رکاوٹیں آتی ہیں، اور واقعات کھو گئے ہیں، انہیں کھوج لگا کر، تحقیق کے ذریعہ تلاش کیا جائے، اس سلسلہ میں علم آثار قدیمہ تاریخ کی مدد کر رہا ہے، اور روپوش تہذیبوں کو سامنے لا رہا ہے۔

اس کی مثال وادی سندھ کی تہذیب ہے، جو تاریخ میں گم ہو گئی تھی، لیکن جب 1920 کی دہائی میں اس کی دریافت ہوئی تو اس نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کو حیران کر دیا، ہڑپہ اور موہنجوڈرو کے شہروں کی منصوبہ بندی اور وہاں سے دریافت ہونے والی اشیاء نے ثابت کر دیا کہ آج سے 5000 سال پہلے وادی سندھ کے لوگ ذہنی طور پر کس قدر ترقی یافتہ تھے۔ اب آثار قدیمہ نے اس تہذیب کے پھیلاؤ کو بلوچستان، پنجاب اور

سندھ سے آگے بڑھا کر راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش تک پھیلا دیا ہے۔ تاریخ کا یہ ورثہ ہمارا ہے، اس سے سیکھنے کی ضرورت ہے کہ تہذیب کیوں کر ابھرتی ہے، اور زوال پذیر ہوتی ہے؟

آریاؤں کی آمد سب سے پہلے پنجاب کے علاقے میں ہوتی ہے، یہیں پر رہتے ہوئے انہوں نے پہلی وید یعنی رگ وید لکھی۔ جب یہ وادی سندھ سے شمالی ہندوستان میں جاتے ہیں، تو اب وادی گنگا و جمنا ویدک تہذیب کے مرکز بن جاتے ہیں، جب کہ وادی سندھ میں ایرانی آجاتے ہیں، ایرانیوں کے بعد یہاں سکندر کے ساتھ یونانی آئے، اور ان کی بستیاں جگہ جگہ آباد ہوگئیں۔ پاکستان کا یہ موجودہ علاقہ بدھ مت کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، اور یونانی و ہندوستانی ملاپ سے گندھارا کلچر ابھرا۔

اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ تہذیبیں اشتراک سے پیدا ہوتی ہیں، یہ اشتراک ان میں سے 298 ق۔م تک توانائی، اور نئی جدتیں پیدا کرتا ہے۔

اس لئے قدیم ہندوستان کی تاریخ سے بھی بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے، موریہ ایمپائر (322 ق۔م) جس میں اشوک جیسا حکمراں پیدا ہوا، جس نے مذہبی رواداری کی بنیاد پر تمام مذاہب کے لوگوں کو آپس میں ملا کر رکھا۔

ہندوستان میں برابر غیر ملکی حملہ آور آتے رہے، اور یہاں کی آبادی میں مل کر ہندوستانی ہوتے رہے، آنے والوں میں کشان، ہن، ایرانی اور یونانی شامل تھے۔ تاریخ میں کسی ایک نسل کی پاکیزگی باقی نہیں رہی، آنے والوں میں حملہ آور بھی ہوتے تھے اور معاش کی تلاش میں ہجرت کرکے آنے والے بھی۔ ان سب نے مل کر ہندوستانی تہذیب اور کلچر کو پیدا کیا۔

لہٰذا تاریخ کے اس تسلسل میں ہندوستان میں عربوں کی آمد کو بھی دیکھنا چاہئے۔ عربوں کی فتح نے سندھ کو امیہ اور عباسی خلافت کا ایک حصہ بنا دیا، مگر جب عباسی طاقت کمزور ہوتی ہے تو سندھ بھی آزاد ہو جاتا ہے اور یہاں رہنے والے عرب سندھ کے سماج میں مل جاتے ہیں۔ عربوں کے بعد شمالی ہندوستان میں ترک آئے، جب غوری خاندان کا خاتمہ ہوتا ہے تو ترکوں کا بھی تعلق غزنی سے ختم ہو جاتا ہے اور وہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہو

جاتے ہیں، یہی صورت حال مغلوں کی ہوئی۔

یہاں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ ہندوستان میں 20 ویں صدی میں جا کر، جب تاریخ میں فرقہ واریت آئی، تو اس وقت ترکوں اور مغلوں کو بیرونی حملہ آور کہا گیا، ورنہ اس سے پہلے انہیں اس نام سے یاد نہیں کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وقت کے ساتھ یہ ہندوستانی ہو گئے تھے۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے، جب ہم اس نقطۂ نظر کا تجزیہ کرتے ہیں کہ پاکستان کی تاریخ کو محمد بن قاسم یا عربوں کی فتح سندھ سے شروع کرنا چاہیئے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اول تو ہم تاریخ کو مذہب سے جوڑ کر اسے ٹکڑوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اس سرزمین سے پیدا ہونے والی اور پروان چڑھنے والی تہذیب سے انکار کر کے، اس کے ورثہ کو اپنانے پر تیار نہیں، تیسرے یہ کہ ہم تاریخ کے تسلسل کو بھی توڑنا چاہتے ہیں کہ جس کا رشتہ اس زمین سے ہے، چوتھے یہ کہ ہم اپنا ماضی ہندوستان سے باہر لے جا کر اس کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہمارا جو ذہن بنے گا اس میں ہندوستان کے ماضی سے انکار اور نفرت ہو گی، اور علیحدگی کے جذبات ہوں گے جو ہماری ذہنی ترقی میں رکاوٹ ہوں گے۔ یہ علیحدگی نفرت اور تنگ نظری کو پیدا کرے گی، اور اس کے نتیجہ میں ہم کلچرل طور پر بنجر ہو جائیں گے۔

ہمیں یہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ پاکستان 1947 میں وجود میں آیا، اس سے پہلے برصغیر ہندوستان کی ایک تاریخ تھی۔ لہٰذا اس سے پہلے کی تاریخ بھی ہماری تاریخ ہے، کیونکہ اس میں ہماری جڑیں پیوست ہیں، ایک مشترک تاریخی اور کلچرل ورثہ لوگوں کو آپس میں ملاتا ہے، انہیں تقسیم نہیں کرتا ہے۔

اس کی مثال یورپ کا براعظم ہے، جس میں کئی ملک ہیں، ان میں سے ہر ملک خودمختار اور آزاد ہے، مگر اس سے بالاتر یورپ کی تہذیب ہے، جو ان تمام ملکوں اور ان کے باشندوں کو آپس میں ملاتی ہے، اگرچہ ماضی میں یہ ملک آپس میں برسرپیکار بھی رہے، مگر علمی وادبی اور تہذیبی طور پر یہ ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ چاہے جرمنی کا فلسفی ہو یا انگلستان کا شاعر، یا سوئٹزرلینڈ کا موسیقار ہو یا سویڈن کا آرٹسٹ، ان سب نے مل کر یورپی

تہذیب کو آگے بڑھایا۔

لہٰذا جب ہم اپنے ماضی کی تشکیل کریں تو اس میں قدیم ہندوستان کی تہذیب کو شامل کرنا چاہئے تا کہ یہ ہمارے تاریخی شعور کو پختہ کرنے میں مدد دے۔

پاکستان میں کچھ دانشوروں کا یہ نقطۂ نظر بھی ہے کہ ہمیں ہندوستان سے نیا کلچرل رشتہ توڑ کر، اسے وسط ایشیا، ایران اور افغانستان سے ملانا چاہئے۔ لیکن ہم سب اس سے واقف ہیں کہ مذہبی رشتے کے باوجود کلچرل طور پر وسط ایشیا، ایران، اور افغانستان کے لوگوں میں اور ہم میں بہت فرق ہے۔

لہٰذا 1947 میں برصغیر ہندوستان سیاسی طور پر تو تقسیم ہو گیا، مگر اسے تہذیبی اور کلچرل طور پر تقسیم کرنے کی کوشش ذہنی طور پر ہمیں بنجر کرے گی۔

اس لئے یہ سوال کہ ہمیں اپنی تاریخ کہاں سے شروع کرنی چاہئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت سے کہ جہاں سے ہمیں تاریخی آثار ملے ہیں، یہ پتھر کے زمانے سے لے کر، وادی سندھ، موریہ ایمپائر، گندھارا تہذیب اور قدیم ہندوستان میں ابھرنے والے مذاہب، افکار، علمی وادبی تحقیقات، ان سب کو شامل ہونا چاہئے تا کہ ہمیں معلوم ہو کہ ہمارا ماضی کن مراحل سے گذرا ہے، اور آج ہم کہاں کھڑے ہیں، ماضی کی یہ تشکیل ہمیں تاریخی شعور بھی دے گی اور ہمارے ذہن کو پختہ بھی کرے گی۔

کیا انگریزی اقتدار برصغیر ہندوستان کے لئے نعمت تھا؟

جب کسی قوم یا سماج کی تاریخ ادھوری ہو، اور پوری طرح سے اسے تحریر میں نہ لایا گیا ہو، تو اس صورت میں تاریخی شعور بھی ادھورا رہتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ نویسی کا المیہ بقول ہمارے دوست جعفر احمد کہ یہ ہے کہ اس میں یا تو ہندو مخالفانہ رویئے ہیں اور یا انگریزوں کی تعریف و توصیف۔ پاکستان کے مورخوں نے کولونیل دور حکومت، اس کے استحصال، اور اس کے منفی اثرات پر بہت کم لکھا ہے، اس وجہ سے ہمارے ہاں عام تاثر یہ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی دور ایک نعمت تھا کہ جس نے اہل ہندوستان کو مہذب بنایا، اور اس کی ترقی کی راہوں کو کھولا۔

ہندوستان کے مورخوں نے اس موضوع پر تفصیل سے تحقیق کی ہے اور کولونیل دور کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ اس عہد میں ترقی کے بجائے ہندوستان کئی لحاظ سے پس ماندہ ہوا۔ مثلاً جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تھا، تو اس وقت برطانوی حکومت ہندوستان میں یہاں کی صنعتوں کو ختم کر کے سماج کو غیر صنعتی بنا رہی تھی۔ جہاں اپنے ملک میں وہ فیوڈل ازم کو کمزور کر رہے تھے، وہاں ہندوستان میں اس کی سرپرستی کر کے اسے مضبوط ادارہ بنا رہے تھے۔

اس لئے برطانوی اقتدار کے بارے میں یہ رائے کہ اس نے ہندوستان کو جدید دور میں داخل کیا، اس کا جواب مورخین نے یہ دیا کہ ان کے اقتدار نے ہندوستان کے بورژوا طبقے کے ابھار اور ترقی کو روک دیا، ورنہ وہ بھی طاقتور ہو کر بایان کی طرح خودمختار کردار ادا کرنے کے قابل تھا۔

نہ صرف یہ، بلکہ کمپنی کے دور حکومت میں انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی قوانین کو مدون کر کے ان کے لئے سیکولر قوانین کی راہیں بند کر دیں۔ اور جہاں تک اہل ہندوستان کو مہذب بنانے کا تعلق ہے تو انہوں نے ان ہی طبقوں کو ''یورپی اور انگریز''

بنایا کہ جو پہلے سے مراعات یافتہ تھے، جب ہندوستانیوں کی اکثریت اسی طرح جاہل اور مفلس رہی۔ اگر انہوں نے یورپی تعلیم کو متعارف کر دیا تو اس میں ان کے مفادات تھے، کیونکہ تعلیم کے ذریعہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن کو بدل کر محکومانہ اور غلامانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اس کا اندازہ لارڈ میکالے کی تحریروں سے ہوتا ہے کہ جس نے کہا کہ یہ رنگ و نسل کے لحاظ سے ہندوستانی ہوں گے، مگر ذہنی طور پر یورپی ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کی مدد سے ہندوستان پر حکومت کرنا آسان ہو گیا۔ فوجی طاقت کے ساتھ، ذہنی تبدیلی نے انگریزی کلچر اور ان کے تسلط کو لوگوں کے دلوں میں بٹھا دیا۔

عام طور سے جو دانشور یا لوگ برطانوی دور کی برکتوں کو یاد کرتے ہیں، وہ اس عہد میں ہونے والی تبدیلیوں کو اہمیت دیتے ہیں، خاص طور سے ٹکنالوجی اور تعلیم سے جہاں تک سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا ذکر ہے تو یہ تبدیلیاں وقت کی ضرورت کے تحت آئیں۔ دنیا کی تاریخ میں یہ عمل دیکھا جا سکتا ہے کہ جب بھی کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے، یا ٹکنالوجی میں ترقی ہوتی ہے تو وہ ایک جگہ محدود نہیں رہتی ہے، بلکہ دوسرے علاقوں میں بھی پھیلتی ہے۔ قدیم زمانے میں جبکہ کمیونی کیشن بہت آہستگی سے کام کرتا تھا، اس وقت بھی پہیہ کی ایجاد یا آگ کی دریافت ایک جگہ نہیں رہی، یہ دنیا کے دوسرے حصوں میں پھیلی، اس لئے اگر انگریز ہندوستان میں نہ آتے، تب بھی ٹکنالوجی، اگر جلدی نہیں تو وقت کے ساتھ یہاں ضرور آتی، اور اس کے نتیجہ میں سماجی تبدیلیاں ہوتیں۔ اس کی مثال بہت سے ایسے ممالک ہیں کہ جو کولونیل تسلط نہیں رہے، مگر وہاں صنعتی عمل بھی ہوا، اور وہ جدید دور میں بھی داخل ہوئے۔

یہ درست ہے کہ کولونیل ازم کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک استحصالی، اور دوسرا مثبت۔ برطانوی دور حکومت میں ہم ان دونوں پہلوؤں کو دیکھتے ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے مثبت اثرات کو ہم بڑھا چڑھا کر بیان کریں اور اس کے استحصالی پہلو کو بھول جائیں۔ ان کی نسل پرستی، طاقت کا استعمال، جبر، ظلم، قانون کا غلط استعمال، اور رعونت یہ وہ اسباب تھے کہ جس نے اہل ہندوستان میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کئے۔ ان کے معاشی استحصال کو اب مورخوں نے وضاحت سے بیان کیا ہے۔ خاص طور سے دادا بھائی نوروجو، اور رجنی پام دت نے اعداد و شمار کے ساتھ بتایا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے

ذرائع کو لوٹا گیا۔ حمزہ علوی نے اپنے ایک مضمون میں بتایا ہے کہ انگلستان کے صنعتی انقلاب میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ منافع شامل تھا کہ جو اس نے ہندوستان میں کمایا تھا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آخر کیوں یہ تاثر ہے کہ برطانوی عہد ترقی، روشن خیالی، انصاف، اور قانون کی بالادستی کا دور تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خاص طور سے پاکستان میں آزادی کے بعد جو سیاسی عدم استحکام رہا ہے، لوگون کو معاشی مسائل رہے ہیں، انصاف وقانون سے لوگوں کو محروم رکھا گیا ہے، اس کی وجہ سے ماضی کا یہ برطانوی عہد لوگوں کو یاد آتا ہے۔ چونکہ ہماری تاریخ اینٹی کولونیل بنتی ہے، اس لئے ہم یہ نہیں دیکھتے کہ برطانوی حکمرانوں نے اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے فوجی قوت و طاقت، معاشی جبر اور سماجی اداروں کو استعمال کیا۔ قانون ہندوستانیوں اور سفید فام اقوام کے لوگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ تھا، یہی حال انصاف کا تھا۔ لیکن چونکہ موجودہ حال کے مقابلہ میں اپنے حکمرانوں کی نااہلی کی وجہ سے، اور مراعات یافتہ وغیر مراعات یافتہ طبقاتی فرق کی وجہ سے لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ برطانوی دور آج سے بہتر تھا۔ لیکن جن ملکوں کی صورت حال بدل گئی ہے، وہاں لوگ برطانوی دور کو بھی بھول گئے ہیں، اس کی ایک مثال ملیشیا کی ہے کہ جو اب معاشی طور پر ایک خوش حال ملک ہے، اس لئے وہ لوگ آگے کے بارے میں سوچتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ برطانوی عہد سنہری تھا، وہ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ہم بحیثیت مجموعی نااہل، غیر ذمہ دار، اور صلاحیت سے محروم قوم ہیں، لہٰذا ہمارے سماج میں اتنی توانائی قوت نہیں کہ وہ اس کو سدھار سکے، اس صورت میں ضروری ہے کہ کوئی غیر ملکی قوت ہم پر حکومت کرے یا ہماری راہنمائی کرے اور ہمارے مسائل کو حل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر عام گفتگو میں یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ امریکی اس کو اپنی ایک ریاست کا درجہ دے کر اس کا انتظام سنبھال لیں۔

کولونیل تسلط کا سب سے بڑا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جس قوم پر حکومت کی جائے، اس کے اندر کا اعتماد ختم کر دیا جائے، اور یہ ثابت کیا جائے کہ وہ پس ماندہ، غیر مہذب، سست اور کاہل ہیں، اور اس قابل نہیں ہیں کہ اپنے معاملات کو سنبھال سکیں، یہ ذہنیت پوری طرح

سے ہمارے سماج میں سرایت کر چکی ہے، اس لئے ذہنیت کے خاتمہ کے لئے دریافتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اول ہمیں اپنی مکمل تاریخ کو تحریر میں لانا ہوگا، تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ برصغیر ہندوستان کا سماج پس ماندہ اور بچھڑا ہوا سماج نہیں تھا۔ قدیم اور عہد وسطیٰ میں اس نے جو ترقی کی اس کو اجاگر کرنا ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی میں اس کا تجزیہ بھی کرنا ہوگا کہ آخر یورپی اقوام یہاں کیوں کامیاب ہوئیں، اور انگریز کیوں اس ملک پر اپنا اقتدار قائم کر سکے۔

دوئم، کولونیل عہد کی تاریخ کے استحصالی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہوگا تاکہ ہمارا ذہن بھی اس سے آزاد ہو، اینٹی ہندو نقطۂ نظر کو چھوڑ کر، ان کے ساتھ مل کر ایک مشترک جدوجہد کرنی ہوگی۔ اگر ہم نے اپنے ذہن کو کولونیل تسلط سے آزاد نہ کیا تو ہم آسانی سے امریکی غلامی کے لئے تیار رہیں گے، اور اسے اپنے لئے ایک نعمت و برکت سمجھیں گے۔

وبائیں اور تاریخ

تاریخ کا مضمون اب سیاست کے علاوہ دوسرے موضوعات کا بھی احاطہ کر رہا ہے۔ مورخ ان پہلوؤں کو سامنے لا رہے ہیں کہ جن کی جانب اب تک توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ان ہی موضوعات میں ایک اہم موضوع بیماری ہے۔ بیماریوں کی وجہ سے لوگ کس طرح متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے رویے کیسے بدلتے ہیں، وہ کن نفسیاتی مراحل سے گزرتے ہیں، ان سے آپس کے رشتے ناطے کیسے متاثر ہوتے ہیں، اوران میں ذہنی اور جسمانی طور پر کیا تبدیلی آتی ہے۔ ان سوالات کو جواب مورخ اپنی تحقیق کے ذریعہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خاص طور سے جب کسی سماج میں وبائیں پھیلتی ہیں۔ تو ان وباؤں کے نتیجہ میں بڑی مقدار میں لوگ موت کا شکار ہوتے ہیں۔ ان کا آبادی پر اثر ہوتا ہے۔ سماجی سرگرمیوں اور سیاسی نظم و نسق ان کی وجہ سے بدلتے ہیں۔ اس لئے ان کا مطالعہ اہم ہو جاتا ہے۔ خاص طور سے قدیم اور عہد وسطی میں پلیگ ایک خطرناک وبا کی صورت میں آتا تھا، اور آبادیوں کا صفایا کرتا ہوا شہروں کو اجاڑتا ہوا چلا جاتا تھا۔ تاریخ میں اس کی تباہیاں محفوظ ہیں۔

مورخوں نے خاص طور سے جہاں ان وباؤں کے اور اثرات کا تجزیہ کیا ہے، وہاں اس جانب بھی اشارہ کیا ہے پلیگ اور وباؤں کی وجہ سے ایمپیریل طاقتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ اوران کی فتوحات کو روکنے میں ان کا بھی دخل ہے۔

ہانس زنی سر (Hans Zinsser) نے اپنی کتاب ''جوئیں اور تاریخ'' (Liece and Historry) میں اشارہ کیا ہے ٹائیفائڈ نے کس طرح بہت سی حکومتوں کے منصوبوں کا خاتمہ کرتے ہوئے ان کی فتوحات کو روک دیا۔ اس موضوع پر ولیم میک نیل (William McNill) کی کتاب، پلیگ اور لوگ (Plague and People) میں پلیگ اور دوسری وباؤں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے یورپ اور ایشیا پر کیا

اثرات ہوئے اس کا جائزہ لیا ہے۔

ان وباؤں میں سب سے زیادہ تباہ کن پلیگ تھا کہ جس کے پھیلنے کے سبب بہت کم وقت میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد موت سے دوچار ہوئی۔ کیونکہ عہد وسطیٰ میں اس کا کوئی علاج نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے جب وہ اس بیماری میں مبتلا ہوتے تھے تو ان کے لیے سوائے موت کو قبول کرنے کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا تھا۔ جب 541ء میں بازنطینی سلطنت میں پلیگ کی وبا پھیلی تو لوگوں نے اپنے بازنطینی شہنشاہ کے نام پر اسے "جسٹنی نین پلیگ" (Justinian Plague) کا نام دیا۔ اس وبا کی وجہ سے صرف قسطنطنیہ میں دو لاکھ لوگ مر گئے۔ اور اس کے سیاست پر بھی دوررس نتائج ہوئے۔ چونکہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس میں ختم ہوگئی۔ اس لئے آبادی کی کمی کی وجہ سے بازنطینی سماج کی توانائی میں کمی آئی۔ اور اس کی سرگرمیوں پر اس کا اثر ہوا۔ سلطنت کے ذرائع محدود ہو گئے۔ اور اس میں شکست اور خستگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے آگے چل کر بازنطینیوں کو عربوں کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ جنہوں نے بازنطینی علاقوں پر جن میں شام، عراق، اور لبنان شامل تھے۔ ان پر بلا کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا اور بازنطینی سلطنت اس قدر کمزور ہوگئی کہ وہ عباسی خلافت کو خراج دینے پر مجبور ہوگئی۔

وبا کس طرح سے سیاست پر اثر انداز ہوتی ہے اس کا ایک ثبوت 1347ء کا ہے جب قبرص میں "بلیک ڈیتھ" یا "کالی موت" نام کی وبا آئی۔ اس نے بڑی تعداد میں لوگوں کا مار دیا۔ جس کی وجہ سے عیسائی آبادی بہت زیادہ خوف زدہ ہوگئی۔ اور انہوں نے جزیرے میں آباد تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے مرنے کے بعد وہ جزیرے پر قابض ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی تمام آبادی یا تو بیماری سے مر گئی یا انہیں قتل کر دیا گیا۔ جب تاجروں کا ایک جہاز وہاں پہنچا تو اس نے کسی زندہ شخص کو وہاں نہیں پایا۔

14 صدیوں میں بلیک ڈیتھ کی وبا نے مصر میں اس وقت تباہی مچائی کہ جب یہاں مملوک خاندان کی حکومت تھی۔ اس وبا میں خاص طور سے حکمراں طبقے کے اس قدر افراد مرے کر حکومت کے لئے یہ مشکل ہو گیا کہ انتظامیہ کے عہدوں کو لئے لوگ مل سکیں۔

اس انتشار اور افراتفری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملوک خاندان سیاسی طور پر کمزور ہو گیا۔ اور مصر پر عثمانی ترکوں نے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ خود عثمانی سلطنت بھی اس وبا میں اس وقت مبتلا ہوئی کہ جب وہ تیزی کے ساتھ بلقان میں فتوحات حاصل کر رہی تھی اس کی وجہ سے نہ صرف عثمانی فوجی وبا میں مرے بلکہ بلقان میں کسانوں کی ایک بڑی تعداد اس کا شکار ہوئی جس کی وجہ سے ان علاقوں میں ترک اقلیت بن کر رہ گئے۔ چونکہ ان کی افرادی قوت بھی گھٹ گئی تھی اس لئے وہ ان زراعتی زمینوں کو استعمال نہیں کر سکے جو کہ کسانوں کے مرنے کی وجہ سے خالی ہو گئی تھیں۔ اس لئے بحیثیت اقلیت کے جب انہوں نے اکثریت پر حکومت کی تو انہیں اپنا تابع اور فرماں بردار بنانے کے لئے جبر و تشدد کو استعمال کیا، جس نے حاکموں اور رعیت کے درمیان نفرت اور دشمنی کی گہری خلیج پیدا کر دی۔

19 صدی میں جب بلقان میں نیشنل ازم کے ابھار کے ساتھ عثمانی سلطنت کے خلاف تحریک چلی تو وہ اسے دبانے اور کچلنے میں ناکام رہی۔ کیونکہ ترک ان علاقوں میں اقلیت میں تھے۔ وہ اکثریت کے نیشنل ازم کے جذبات کا مقابلہ نہیں کر سکے اور بلاخر بلقان کی ریاستیں عثمانی سلطنت سے آزاد ہو گئیں۔

اس ضمن میں اگر یورپی لوگوں کا امریکی تسلط کا جائزہ لیا جائے تو یہ عنصر وہاں بھی نظر آئے گا اگرچہ یورپی لوگوں کا کامیابی میں ان کی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کا حصہ ہے کہ جس میں بارود، بندوقیں، اور گھوڑا اہم تھے جب کہ امریکہ کے قدیم لوگ ٹیکنالوجی میں ان سے بہت پیچھے تھے۔ اس لئے یورپی اقوام کے یہ ممکن ہوا کہ انہوں نے آسانی سے قدیم باشندوں کو شکست دے کر انہیں کچل کر رکھ دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بیماریوں اور وباؤں کا بھی ان کی کامیابی میں حصہ ہے جب ہسپانوی جرنل نے ایزٹک فوج پر حملہ کیا ہے تو ایزٹک جنرل اس پوزیشن میں تھا کہ وہ ہسپانوں فوجیوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس نے مزاحمت کرتے ہوئے انہیں شہر سے نکال دیا تھا مگر جنگ کے دوران ایزٹک فوج میں چیچک کی بیماری پھیل گئی جس کے جراثیم اہل یورپ اپنے ساتھ لائے تھے کیونکہ ایزٹک لوگوں میں اس بیماری کے خلاف مزاحمت نہیں تھی اس لئے فوجیوں کی ایک بڑی تعداد مع ان کے جرنیل کے اس وبا کا شکار ہو گئے۔ چونکہ اہل یورپ میں چیچک کی بیماری سے بڑی مزاحمت تھی اس لئے وہ اس

وبا میں بچ گئے اور ایزٹک لوگوں پر فتح حاصل کر لی۔

اہل یورپ کے آنے سے پہلے جنوبی اور شمالی امریکہ کے باشندے صحت مند تھے اور ان بیماریوں سے قطعی نا آشنا تھے جو کہ یورپ میں موجود تھیں۔ نہ ہی ان وباؤں کا شکار تھے کہ جس کا سامنا قدیم دنیا کو کرنا پڑ رہا تھا۔ اس وجہ سے ان بیماریوں سے مزاحمت کرنے کی ان میں قوت نہیں تھی۔ جن میں چیچک، خسرہ، اور انفلوئنزا قابل ذکر تھیں۔ جب اہل یورپ ان بیماریوں کے جراثیم اپنے ساتھ لائے اور یہ بیماریاں نئی دنیا میں بھرنا شروع ہوئیں۔ تو ان سے مقامی باشندے بری طرح سے متاثر ہوئے۔

مثلاً ان بیماریوں کی وجہ سے 17 صدی میں نیو انگلینڈ میں کیا ہوا اس کا ذکر ایک انگریز نے کیا ہے اس کے بیان کے مطابق یہاں چند مقامی باشندے ان نئی بیماریوں کے باعث زندہ رہ سکے۔ جو بچ گئے تھے انہوں نے اپنے گاؤں چھوڑ دیئے اور پناہ کی غرض سے ہمسایہ قبائل کے پاس چلے گئے۔ گاؤں ویرانی کی حالت میں ہیں، کیونکہ یہاں کوئی رہائشی نہیں ہے جو ان کی دیکھ بھال کرے۔ یہاں پر ہزاروں مردہ انڈینز کی لاشوں کے ڈھانچے اور ہڈیاں بکھری ہوئی ہیں کیونکہ انہیں دفن کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔"

اہل یورپ نے مقامی باشندوں کی ایک کمزوری کو دیکھتے ہوئے ان میں بیماریوں کے جراثیم پھیلائے۔ مثلاً ان میں جب کمبل تقسیم کئے گئے تو ان میں بیماریوں کے جراثیم تھے تا کہ اس طرح سے ان کا قتل عام کیا جائے۔ اور ان کی زمینوں پر قبضہ کیا جائے۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک امریکی مورخ نے یہ اعتراف کیا ہے کہ یورپیوں نے امریکہ کو اپنی فوجی صلاحیتوں کی وجہ سے فتح نہیں کیا اور نہ ہی اس وجہ سے کہ ان کے مذہبی جذبات نے انہیں اس پر ابھارا اور نہ ہی اس میں ان کی لالچ کا کوئی زیادہ حصہ وہ اس لئے فتح یاب ہوئے کہ انہوں نے منصوبے کے تحت بائیولوجیکل جنگ لڑی اور اس میں بیماریوں کے ذریعہ مقامی باشندوں کو مارا۔"

پلیگ کے تاریخ پر اثرات

1347 کی بات ہے کہ منگول سردار جالی بیگ نے کریمیا کے شہر کافہ کا محاصرہ کیا۔ یہ شہر اس وقت اٹلی کی ریاست جنوا کی کالونی تھا۔ محاصرے کے دوران منگول فوج میں پلیگ یا طاعون کی بیماری پھیل گئی۔ جانی بیگ نے اس موقع پر چند مردہ لاشوں کو منجنیق کے ذریعہ شہر میں پھینک دیا۔ جنوا کے لوگ جو اس شہر میں تھے وہ ان مردہ جسموں اور بیماری سے اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ انہوں نے فوراً جہازوں میں سوار ہو کر شہر چھوڑ دیا۔ مگر بدقسمتی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا کیونکہ وہ پلیگ کے جراثیم اپنے ساتھ اٹلی لے گئے۔ وہاں سے یہ وبا پورے یورپ میں پھیل گئی۔ جس نے یورپ کو خوف و دہشت سے ہلا کر دکھ دیا۔

1351 میں جا کر جب اس بیماری اور وبا میں کمی آئی۔ اس وقت تک یورپ تکالیف و مصائب کے ایک ایسے طوفان سے دوچار ہوا تھا کہ جس نے اس کے سماج کو بدل کر رکھ دیا۔ یہ وبا صرف یورپ تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اس کے اثرات مسلمان ممالک پر بھی ہوئے۔ کیونکہ اس وبا کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے کہ:

مشرق اور مغرب دونوں کی تہذیبیں پلیگ کی وبا میں مبتلا ہوئی ہیں جس کی وجہ سے قومیں تباہ و برباد ہوئیں ہیں اور آبادیاں صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ اس نے تہذیب کی بہت ہی اچھی چیزوں کو نگل لیا ہے اور ان کا صفایا کر دیا ہے۔ اس نے ان کی توانائی کو گھٹا کر ان کے اثرات کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس نے ان کے اقتدار کو بھی مٹا دیا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق یورپ کی آبادی 45 ملین سے گھٹ کر 25 ملین رہ گئی۔ ایک مورخ کے مطابق پلیگ کی وبا نے شہروں اور گاؤں کی پوری آبادی کا صفایا کر دیا۔ خاندان کے خاندان غائب ہو گئے، گھر ویران ہو گئے، کھیتیاں بنجر ہو گئیں۔ اس نے

امیر و غریب دونوں کو بغیر کسی فرق کے قتل کیا، بیماری کے علاج میں کوئی دوا کام نہ آئی۔ یورپ کا سب سے عمدہ میڈیکل اسکول جومون پیرس تھا اس کے اسٹاف کے تمام ڈاکٹرز بھی اس وبا میں مارے گئے۔''

موجودہ دور میں مورخ اس وبا اور اس کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان نتائج کی نشان دہی کر رہے ہیں کہ جن سے یورپ کا سماج دوچار ہوا تھا۔ مورخوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ اس وبا کا مثبت نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کا سماج عہد وسطی سے جدید دور میں داخل ہو گیا۔ جب بیماری کی وجہ سے آبادی میں کمی واقع ہوئی تو اس کے نتیجہ میں کسانوں اور دست کاروں کی اہمیت بڑھ گئی۔ اور کسانوں نے اپنے حقوق کے لئے بغاوتیں کیں جس کا دائرہ پورے یورپ میں پھیل گیا۔ ان میں کچھ بغاوتیں ایسی تھیں کہ جن میں مذہب کا غلبہ تھا، مگر بنیادی طور پر یہ سماجی برابری اور کے خلاف تھے۔ کہ جس نے ان کی سماجی اور معاشی حالت کو خراب کر رکھا تھا۔ اگرچہ ان میں کافی بغاوتوں کو سختی اور تشدد کے ساتھ کچل دیا گیا۔ مگر اس کے باوجود مزدور طبقے نے اپنی تنخواہوں میں اضافہ کو حاصل کر کے اپنا معیار زندگی بڑھا لیا۔ اور ان کے کام کے اوقات میں بھی کمی ہوئی۔ جب فیکٹری کے مالکوں نے زیادہ پیداوار کی خاطر کام کے اوقات بڑھائے تو اس کے عوض مزدوروں کو زیادہ تنخواہ دی گئی۔

جب فیکٹریوں میں مزدور کی تعداد کم ہوئی تو اس مسئلہ کے حل کے لئے نئی ایجادات کی طرف توجہ دی گئی۔ تاکہ مشینوں کے ذریعہ محنت کے کام کروائے جا سکیں۔ اس لئے کچھ مورخوں کا خیال ہے کہ اس صورت حال میں کہ جس میں معاشی طور پر خوش حالی تھی۔ اور سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی ہو رہی تھی۔ اس نے آگے چل کر پورے یورپ میں ریناسانس کو پیدا کیا، جس نے یورپ کے سماج میں ایک نئے شعور اور آگہی کو پیدا کیا۔ اس بیماری کی وجہ سے چرچ کا اثر بھی کم ہوا۔ کیونکہ چرچ معہ اپنی روحانی اور مادی طاقت کے اس وبا کو روکنے میں ناکام رہا اس نے لوگوں کی عقیدت میں کمی کر دی۔

وبا کی وجہ سے حکمرانوں کے اختیارات بھی محدود ہوئے کیونکہ جب آبادی کم ہوئی تو اس کی وجہ سے بادشاہ کو ٹیکس کی آمدنی میں بھی کمی آئی۔ جب حکمران مالی طور پر کمزور ہوئے تو ان کی سیاسی طاقت و اختیارات بھی اس سے متاثر ہوئے۔

کیونکہ وبا میں امراء کی ایک بڑی تعداد مرگئی۔اس لئے ان کو جائداد کی وراثت کا مسئلہ بھی ہوا۔ اور پرانے امراء کے طبقہ کی جگہ امراء کی نئی کلاس ابھری، جس کا نقطۂ نظر حالات کے مطابق تھا۔اور وہ ذہنی طور پر تبدیلی کے لئے تیار تھے۔اس کی وجہ سے میڈیکل سائنس اوراس کی تعلیم و پریکٹس میں بھی تبدیلی آئی۔انہیں پرانے طریقوں اور دواؤں کی جگہ تحقیق کے ذریعہ بیماریوں کو نئے انداز سے سمجھنے کی کوشش کی۔ پرانے حکماء کہ جن میں بقراط، جالینوس اورابن سینا مشہور تھے اوران کے فلسفہ اورنظریات پر میڈیل سائنس کو پڑھایا جاتا تھا۔اب ان کو متروک کردیا گیا۔نئ تحقیق کی ابتداء ہوئی کہ جس میں تجربات کے ذریعہ بیماریوں کی وجوہات کو سمجھا گیا۔اور پھران کا علاج دریافت کیا گیا۔ایک اوراہم تبدیلی یہ تھی کہ اب لاطینی زبان کی میڈیکل کتابوں کی جگہ مقامی زبانوں میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ اس کی وجہ سے عام تعلیم یافتہ لوگ بھی ان کتابوں کو پڑھنے لگے اور وباؤں و بیماریوں کے بارے میں ان کی آگہی زیادہ ہوگئی۔

وبا کا اثر ماحولیات پر بھی ہوا۔ جب کھیت ویران ہو گئے۔ان پر کاشت کرنے والا کوئی نہیں رہا تو ان کی جگہ گھنے جنگل پیدا ہو گئے جن میں جانوروں کی ایک بڑی تعداد رہنے لگی۔

جہاں کچھ مورخوں کا کہنا ہے کہ وبا نے لوگوں کے عقیدے کو کمزور کیا، وہیں کچھ مورخ ہیں ان کی دلیل ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس جب وبا میں بڑی مقدار میں لوگ مرے تو جو زندہ رہ گئے ان کا مذہب کا عقیدہ مضبوط ہو گیا۔ان کا چرچ سے لگاؤ اور زیادہ بڑھ گیا۔ موت کے بعد دوسری دنیا اور روز قیامت وحساب کے بارے میں ان کے خیالات میں مضبوطی آئی۔ جنت و دوزخ کے بارے میں ان کا یقین بڑھ گیا۔ان خیالات کی وجہ سے یورپ کے سماج میں چرچ اوراس کے عہدے داروں کا اثر ورسوخ اور زیادہ ہو گیا اور وہ لوگوں کے مذہبی جذبات کے تحت مذہبی رسومات ادا کرنے لگے۔ کچھ لوگ مذہب کے ساتھ ساتھ تصوف کی طرف راغب ہو گئے۔اولیاء کے مزاروں کی زیارت عام ہو گئی۔

مورخوں نے اس پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جب لوگوں نے موت کو اس قدر قریب سے دیکھا۔تو اس کے نتیجہ میں وہ نفسیاتی طور پر دباؤ کا شکار ہو گئے اوران کے

نقطۂ نظر میں غمگینی، اداسی افسردگی آ گئی۔ ان کی اس ذہنی کیفیت کا اثر اس دور کی موسیقی، آرٹ اور ادب پر ہوا۔ دنیا کے بارے میں امید کے بجائے مایوسی کے جذبات غالب آ گئے۔ لیکن ایک طرف جہاں یورپ کے لوگ مایوسی میں ڈوب رہے تھے۔ مسلمان علماء یہ تبلیغ کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو وبا سے ڈرنا نہیں چاہیے بلکہ اس کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ وبا میں مر جائیں گے تو ان کو شہید کا درجہ ملے گا۔ انہوں نے پلیگ کی وبا کو معتدی بیماری نہیں سمجھا۔ بلکہ اس کا اظہار کیا کہ یہ دراصل خدا کی طرف سے انسانوں کے گناہوں کی سزا ہے۔

ہمیں ہیروز کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

تاریخ میں جب بھی ہیروز اوران کی شخصیتوں کوابھارا جاتا ہےتو اس میں سب سے پیش پیش حکمراں طبقے، سیاسی جماعتیں، اورسماجی اور ثقافتی گروہ ہوتے ہیں کہ جوان شخصیتوں کے افکار وخیالات اوران کے کردار کوابھار کرلوگوں کے جذبات کومتاثر کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ ان کی مدد سےلوگوں کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کی باتوں کوصحیح تسلیم کریں اوران کی حمایت کریں۔

سیاستدانوں نوکر شاہی کے عہدے داروں اورقدامت پسند حلقوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ہیرو کی شخصیت کو بنانے اوراس کو پراثر انداز میں ڈھالنے کے لئے دانشوروں کی مدد حاصل کریں۔ یہ اپنی تحریوں اور پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں میں ان خیالات کو پیدا کرتے ہیں کہ ہیرو میں عام انسانوں سے زندہ صلاحیت ولیاقت تھی۔ وہ غلطیوں سے پاک تھا۔اس میں حالات کوسمجھنے کاشعور تھا۔ جب کسی شخصیت کے بارے میں یہ خیالات راسخ ہوجائیں تو پھرلوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اس کے افکار وخیالات کو بلاکسی تنقید کے تسلیم کرلیا جائے۔اس سے وفاداری کا اظہار کیا جائے۔اوراس کی شخصیت کو اپنے لئے بطور ماڈل تصور کیا جائے۔ یہ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس کی مدد سے حکمراں طبقے اپنے اقتدار کوتحفظ دینا چاہتے ہیں اوراس کی مدد سے قدامت پرست روایات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ حکمراں طبقے اپنی ضرورت اورتقاضوں کےتحت اپنے ہیرو کےخیالات وافکار بھی بدل دیتے ہیں۔اوران کی مدد سے اپنے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ ایک ہیرو کی شخصیت وقت کے ساتھ بدلتی رہی

ہے اور اس کے خیالات کو بھی مسخ کیا جا تا رہا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی حکمران طبقے کسی بحران میں متلا ہوتے ہیں اپنی بدعنوانیوں اور نا اہلی کے سبب لوگوں میں اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں تو ان حالات میں وہ کسی ایسی شخصیت کا سہارا لیتے ہیں کہ جو لوگوں میں مقبول ہوتی ہے اور جس پر لوگوں کا اعتماد ہوتا ہے۔ اس وقت یہ لوگ اس کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اس شخصیت کے پیروکار ہیں اور اس کے منصوبوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں تا کہ اس کی مدد سے وہ اپنا کھویا ہوا وقار بحال کر سکیں۔ اس کی مثال ہمارے ہاں دیکھنے میں آتی ہے کہ ہر آنے والے حکمران خود کو اقبال اور قائداعظم کا پیروکار ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ان کے ویژن کو پورا کریں گے۔

خاص طور سے قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کو اس وقت ایک طرف سیکولر اور لبرل طبقے استعمال کر رہے ہیں اور ان کی تقاریر سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ ایک لبرل ریاست کے قیام کے حامی تھے۔ مگر ملک میں جیسے جیسے مذہبی انتہا پسندی کو فروغ ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جناح صاحب کی شخصیت بھی اب بدل رہی ہے اور مذہبی حلقے انہیں اپنے رنگ میں ڈھال رہے ہیں تا کہ ان کے ذریعہ وہ اپنی فکر کو بڑھائیں۔ اس سلسلہ میں قدامت پرست، مذہبی اور نام نہاد جمہوری سیاسی جماعتیں بھی ان کے ساتھ ہیں۔ دونوں جانب سے ان کی شخصیت کے استعمال کے بعد اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اصل میں کیا تھے؟

حکمران طبقوں کو ایک ہیرو کی اس وقت بھی ضرورت ہوتی ہے جب وہ سیاسی و اقتصادی بحرانوں کو شکار ہوں، ایسے حالات میں وہ تلاش کرتے ہیں کہ کوئی سی شخصیت انہیں اس گرداب سے نکالے گی۔ اس کی ایک مثال فرانس کے بادشاہ نپولین سوم کی ہے، جب اس کی حکومت کو خطرات پیش آئے، ملک میں اس کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں تو اس نے یہ فیصلہ کہ نپولین اول، جو کی سینٹ ہلینا میں دفن تھا، اس کی لاش کو فرانس میں لایا جائے اور یہاں دفن کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے تقریب منعقد ہوئی۔ اس کا تابوت شان وشوکت کے ساتھ پیرس آیا اور ایک عالیشان مقبرے میں اسے دفن کیا گیا جو بہت جلد لوگوں کے لئے زیارت گاہ بن گیا۔

اس سے نپولین سوم نے کئی مقاصد حاصل کئے ایک تو اس سے رشتہ کی بنیاد پر،

کہ یہ اس کا چچا تھا، اس نے لوگوں کو یہ تاثر دیا کہ اس کی حکومت نپولین اول کی حکومت کا تسلسل ہے اور وہ فرانس کا جائز حکمران ہے دوسرے اس نے اس عمل سے لوگوں کے جذبات کو ابھارا۔ ان میں قوم پرستی کے احساسات کو پیدا کیا،، اور اس ذریعہ سے اپنے خلاف مخالفانہ تحریکوں کو ختم کرنا چاہا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی مقبولیت زیادہ دیر قائم نہیں رکھ سکا اور اسے فرانس چھوڑ کر جانا پڑا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ حالات کے مطابق کچھ شخصیتوں کو ہیرو کا درجہ دے دیتے ہیں مگر جب حالات بدلتے ہیں تو یہی لوگ اسے اونچائی سے گرا کر ذلیل و خوار کر دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخصیت لوگوں کو امن و امان سے ہم کنار کرتی ہے۔ انہیں خوشحالی دیتی ہے ان کی امنگوں کو پورا کرتی ہے تو اس صورت میں لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں لیکن جیسے ہی وہ لوگوں کی توقعات پوری کرنے سے قاصر ہوتا ہے تو لوگوں کا رویہ بھی اسی تیزی سے بدل جاتا ہے اور وہ ان کی نظروں میں معتوب ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال میسولینی کی ہے کہ جس نے اقتدار میں آنے کے بعد یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اٹلی کی شاندار تاریخ کو دوبارہ سے بحال کرے گا اور رومی شان و شوکت کو واپس لائے گا۔ لوگوں نے بڑی جوش سے اس کا خیر مقدم کیا اس کی داخلی پالیسیوں سے فائدہ اٹھایا۔ اور اس نے شمالی افریقہ میں نو آبادیات قائم کیں تو اس کی حمایت کی۔ اس کی شخصیت میں انہیں ایک رومی شہنشاہ نظر آیا جو اٹلی کو فتوحات کی جانب لے جا رہا تھا۔

لیکن جب اٹلی دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کے ساتھ شامل ہوا اور جنگ کی صورت میں اس پر تباہی و بربادی آئی۔ اس نے لوگوں کو مسولینی سے بیزار کر دیا وہ اس کی ابتدائی کامیابیوں کو بھول گئے، یہاں تک کہ مجمع کے ہاتھوں نہ صرف اس کا قتل ہوا، بلکہ لوگوں نے عبرت کے طور پر اس کی لاش کو الٹا لٹکا دیا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ دنیا میں ہیروز اور ان کی شخصیتوں کو تجارتی نقطۂ نظر سے اہمیت دی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جا سکے۔ اس کی مثال مشہور انقلابی راہنما چی- گیویرا کی ہے، جو فیڈل کاسترو کے ساتھ کیوبا میں آمریت کے خلاف جدوجہد میں شریک ہوا اور جب یہاں انقلاب نے کامیابی حاصل کر لی

تو بولیویا چلا گیا تا کہ وہاں انقلاب لا سکے، مگر یہاں امریکہ کی سی-آئی-اے کی مدد سے بولیویا کی فوج نے اسے قتل کر دیا۔ ایک انقلابی راہنما کی حیثیت سے جب اس کی شہرت پوری دنیا میں پھیلی تو اس کے تجارتی فرموں نے فائدہ اٹھایا اور اس کے پوسٹر بڑی تعداد میں چھپ کر مارکیٹ میں آ گئے۔ اور اس کی اس قدر پبلسٹی ہوئی کہ وہ نوجوانوں کا ہیرو بن گیا۔ جس قدر اس کی مقبولیت بڑھی اسی قدر اس کے پوسٹر فروخت ہوئے۔ 1960 اور 1970 کی دھائیوں میں یورپ میں ہر طالب علم کے کمرے میں اس کا پوسٹر نظر آتا تھا۔

وقت کے ساتھ اس کا انقلابی کردار دھیما پڑتا چلا گیا۔ لیکن تجارتی مقاصد کے تحت بار بار اس کی یاد کو دہرایا گیا لیکن اب اس کا مقصد انقلابیوں کو متاثر کرنا نہیں تھا، مگر بطور فیشن تھا۔ پوسٹر کے ساتھ ہی اس پر کتابیں اور پمفلٹ بھی شائع ہوئے۔ اس کی ٹی-شرٹس بھی بازار میں آ گئیں۔ اور اب یہ وہ لوگ استعمال کر رہے ہیں کہ جو چی-گیویرا کے انقلابی کردار سے ناواقف ہیں۔ سرمایہ داری اور تجارتی مفادات نے اس کے کردار کو گھٹا کر محض ایک فیشن بنا دیا

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کل کے حالات میں جب کہ دنیا تیزی سے ترقی کر رہی ہے معلومات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ کیا اس صورت حال میں دنیا کو ابھی بھی ہیروز کی ضرورت ہے۔ یا ان کا زمانہ ختم ہو گیا اور لوگوں میں خود اعتمادی آ گئی ہے کہ جس نے شخصیتوں کے سہاروں کو ختم کر دیا ہے؟ اس کا جواب ہاں اور نہ دونوں صورتوں میں ہے۔ ان معاشروں میں کہ جہاں جمہوری ادارے اور روایات مضبوط ہیں۔ وہاں کسی مسیحا کی آمد کا نظریہ زوال پذیر ہو رہا ہے۔ جمہوریت برابر حکومتوں کو بدلتی رہتی ہے اور کوئی ایک شخص یا پارٹی مستقل طور پر اقتدار میں نہیں رہتا ہے جب ادارے افرادی قوت اور اشتراک کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ تو اس صورت میں کسی ایک فرد کو یہ موقع نہیں ملتا ہے کہ وہ تمام اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لے اور اپنی شخصیت کو معاشرے کے لئے ناگزیر بنا لے۔ حکومت و اقتدار میں آنے کے بعد وہ سیاسی طور پر مجبور ہوتا ہے کہ جب بھی اہم فیصلے کرے تو اس میں پروفیشنل لوگوں کی ہدایات شامل ہوں، جو اپنے اپنے شعبوں میں ماہرین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ فرد کے کردار اور اس کے اختیارات کو ناجائز استعمال سے روک دیتی ہے۔

لیکن ان معاشروں میں کہ جہاں جمہوری ادارے کمزور ہیں اور جہاں اجتماعی لیڈر شپ کا تصور نہیں ہے۔ اس صورت میں فرد تمام اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیتا ہے اور جمہوری اداروں اور اجتماعی لیڈر شپ کو آگے نہیں بڑھنے دیتا۔ ایسے معاشروں میں سیاسی جماعتیں اور سماجی گروپس بھی شخصیتوں کا سہارا لے کر اپنے خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان میں نہ تو تحقیقی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ فکر و سوچ، اس لئے آسان طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شخصیت کے نام پر اسے ہیرو بنا کر اپنے مفادات کو حاصل کیا جائے۔ لہٰذا جو لوگ ماضی سے ہیروز کو نکال کر لاتے ہیں۔ حال کی روشنی میں ان کی شخصیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان کی ذہنی کم مائیگی اور نا اہلی انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی ہیرو کو تقدس کا درجہ دے کر، لوگوں کے جذبات کو ابھاریں۔ اس مقصد کے تحت ہیروز کو تشکیل دینا، عوام کو گمراہ کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ جب تک سلسلہ جاری رہے گا۔ عام لوگ شخصیتوں کے جال میں گرفتار اپنی سوچ اور فکر سے محروم رہیں گے۔

لوگ غداری کیوں کرتے ہیں؟

ہمیں اپنی تاریخ میں، غداری کی کئی مثالیں ملتی ہیں، غداری کا یہ تسلسل ماضی سے حال تک نظر آتا ہے، اس لئے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے سماج میں لوگ اپنی قوم اور ملک سے غداری کرتے رہے ہیں؟ اکثر ایک وجہ تو یہ دی جاتی ہے کہ لوگ غداری پیسہ کی لالچ میں کرتے ہیں، جب انہیں یہ پیش کش کی جاتی ہے تو ان کے سامنے اپنے ذاتی مفادات ہوتے ہیں اور وہ اس کے اثرات اور نتائج کو نہیں سوچتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں ان افراد نے بھی غداری کی کہ جو دولت مند تھے، اور جن کے پاس مال و دولت کی کمی نہ تھی، انہوں نے بھی غداری کی، اس کی وجہ یہ بتائی جاسکتی ہے کہ یہ لوگ دولت کے لئے نہیں بلکہ اقتدار کے لئے غداری کر رہے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کے ذاتی تعلقات اپنے وقت کے حکمرانوں سے اچھے نہ رہے ہوں یا ان کے ساتھ انصاف نہ کیا ہو، اس لئے انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے غیر ملکی طاقتوں کا ساتھ دیا۔

برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں ہمارے سامنے بہت سی مثالیں ہیں، میر جعفر نے سراج الدولہ کے خلاف اس لئے غداری کی تا کہ وہ خود نواب بن جائے، اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ میر صادق نے ٹیپو سلطان سے اس لئے غداری کی کہ وہ اس ذریعہ سے ذاتی طور پر فائدے اٹھانا چاہتا تھا۔ 1857 میں جب کہ دہلی کا محاصرہ انگریزی فوج نے کر رکھا تھا اور باغی ان کا مقابلہ کر رہے تھے، اس وقت میں مغل شاہی خاندان کے افراد، امراء، اور شہر کے با اثر لوگ انگریزوں سے خط و کتابت کر کے انہیں خبریں پہنچا رہے تھے۔ ان کا مقصد یہی تھا کہ کامیابی کے بعد وہ انگریزی حکومت سے مراعات و فوائد حاصل کریں، اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ سلیم قریشی نے ''غداروں کے خطوط'' برٹش لائبریری کے

ذخیرے سے نکال کر انہیں شائع کیا ہے۔ ان خطوط میں دہلی میں مقیم مخبروں، جاسوسوں، یا غداروں نے انگریزوں کو ہر بات کی اطلاع دی، جس کی وجہ سے انہیں باغیوں سے لڑنے میں کامیابی ہوئی۔ مثلاً رجب علی نامی ایک شخص اطلاع دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ: ''بارہ تاریخ کو جو توپیں پکڑی گئیں تھیں ان میں سے ایک توپ کے گولے کو جب کھولا گیا تو پتہ چلا کہ اس میں نیا بارود بھرا گیا تھا۔ یہ بارود کافی خام اور کمزور درجہ کا ہے۔ اس سے ان اطلاعات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کے پاس اچھے بارود کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے اور روزانہ استعمال کے لئے جو بارود بن رہا ہے وہ بالکل بیکار ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ چونکہ پلاسی کی جنگ، ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ اور 1857 میں انگریز فتح یاب ہوئے اس لئے جن لوگوں نے غداری کی تھی، انہیں انعام و اکرام سے نوازا گیا، اور معاشرے میں ان کا سماجی درجہ حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے مستحکم ہو گیا۔ ہمارے پاس ایسے شواہد نہیں کہ جن کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ ان کی غداری کی وجہ سے اس وقت لوگوں میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات تھے۔

شاید غداری کا یہ تصور ہمارے ہاں نیا ہو، اور اس کی بنیاد موجودہ دور میں ابھرتا نیشنل ازم ہو، کہ جس میں فرد کی وفاداری قوم اور ملک سے ہو جاتی ہے۔ جب کہ بادشاہت کے دور میں وفاداری کا مرکز بادشاہ اور حکمراں ہوتا تھا، اگر اس سے اختلافات ہوں، یا دشمنی ہو، تو اس صورت میں وفاداری کو تبدیل کرنا برا نہیں سمجھا جاتا تھا، لہٰذا لوگ بھی اس کے عادی تھے، اور جو لوگ وفاداری بدلتے تھے، ان کے خلاف ان کے جذبات نہیں ابھرتے تھے۔

اب موجودہ دور میں جب ہم تاریخ کی تشکیل نو کر رہے ہیں تو اس وقت اس کی تشریح نیشنل ازم کے نقطۂ نظر سے کر رہے ہیں اور ہیرو غدار کے درمیان فرق کو واضح کر رہے ہیں۔ لہٰذا اب میر جعفر، میر صادق، حکیم احسن اللہ، بہادر شاہ کے معالج اور ان کے دوسرے درباری غداروں کی صف میں آ گئے۔

مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے قیام کے بعد سے عرب ملکوں میں ایسے بہت سے واقعات ہوئے کہ جہاں افراد نے اپنے ملک و قوم سے غداری کر کے اسرائیل کو معلومات فراہم کیں۔ 1967 کی جنگ سے پہلے ایک عراقی پائلٹ روس کا مگ طیارہ لے کر اسرائیل

چلا گیا، جس کے عوض اسے ایک ملین ڈالر کی رقم ملی۔ اسرائیلیوں نے اس طیارہ کا تجزیہ کر کے تیاری کی کہ اس کا کس طرح مقابلہ کیا جائے۔ ان معلومات سے انہیں عرب ملکوں پر فوجی برتری ہوگئی۔

انور سادات کے زمانے میں جمال ناصر کے داماد مروان نے اسرائیل کو 1973 کی جنگ کی پوری خفیہ معلومات پہنچائیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اسرائیل کو اس پر یقین نہیں آیا، اس کے علاوہ اس نے اور بہت سی معلومات انہیں دیں، کیونکہ یہ انور سادات کے بہت قریب تھا۔

اگر اس کا تجزیہ کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے نظام میں کہ جہاں آمریت ہو، شخصی حکومت ہو، وہاں قوم کی تشکیل نہیں ہوتی ہے، اور نہ لوگوں میں ملک سے وفاداری کے جذبات ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ذاتی منفعت اور فوائد افراد کو غداری کی جانب لے جاتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں کہ جہاں یا تو بادشاہتیں ہیں یا آمریتیں، وہاں ملک اور قوم کو ان کے مفادات کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ملک کے ذرائع پر یہ قابض ہوتے ہیں، اس لئے لوگوں میں قومی شناخت اور تشخص ابھرنے نہیں پاتا۔ فرد اپنی ذات کے لئے قوم و ملک کو قربان کر دیتا ہے۔

سرد جنگ کے زمانہ میں، جب روس اور مغربی ملکوں کے درمیان محاذ آرائی ہو رہی تھی، اس وقت ملک و قوم سے غداری کی ایک اور وجہ ابھری، روس کے انقلاب نے بہت سے دانشوروں کو یہ احساس دلایا تھا کہ دنیا میں معاشی خوش حالی اور امن و امان اور انصاف کے لئے سوشل ازم کا کامیاب ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ روس اس کی ایک علامت تھا، اس لئے جب اس کے خلاف سازشیں ہوئیں، اور اسے ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے، تو اس وقت امریکہ اور یورپ کے بہت سے دانشوروں نے خفیہ طور پر روس کو خبریں پہنچائیں اور اس طرح اپنے ملک سے غداری کی۔ ان کی اس غداری کی وجہ ان کی نظریاتی وفاداری تھی جس کے زیر اثر انہوں نے اپنی تمام مراعات کو کھو دیا، سزا کے طور پر موت کو قبول کیا، یا جلاوطنی کو اختیار کر کے ساری زندگی غیر ملکوں میں گذاری۔

تاریخ اور شخصیتیں

تاریخ میں شخصیتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں، جب یہ شخصیتیں اپنا تاریخی کردار ادا کر کے ختم ہو جاتی ہیں، تو اس کے باوجود وقت کے سیاسی، سماجی، ادبی اور معاشی تقاضوں کے تحت انہیں تاریخی گمنامی سے نکال کر باہر لایا جاتا ہے اور استعمال کیا جاتا ہے۔ ان شخصیتوں میں سیاستداں، حکمراں، ادیب وشاعر، مفکر اور دانشور بھی شامل ہیں۔ مثلاً اس کی ایک مثال فارسی کے مشہور شاعر مولانا روم ہیں۔ اچانک ان کی شاعری یورپ اور امریکہ میں مقبول ہوگئی، شاید اس کی وجہ امریکہ اور یورپ کی مصروف زندگی ہے کہ جس میں تکنالوجی نے ان کے جذبات کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہی صورت حال مفکروں اور دانشوروں کی ہوتی ہے کہ جن کے خیالات و افکار وقت کے ہاتھوں گمنامی میں چلے جاتے ہیں، مگر جب ضرورت پڑتی ہے تو انہیں تلاش کر کے زندہ کیا جاتا ہے، اس کی مثال ابن خلدون کے افکار ہیں کہ جن پر خود اس کے زمانے میں زیادہ توجہ نہیں دی گئی، اور پھر اس کا مشہور "مقدمہ" کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گیا، لیکن جب 19 صدی میں سلطنت عثمانیہ کا زوال ہوا تو، ترک دانشوروں اور سیاستدانوں نے اس کو گوشہ گمنامی سے نکالا تا کہ اس کے مطالعہ کے بعد وہ تجزیہ کریں کہ ان کی سلطنت کیوں زوال پذیر ہو رہی ہے اور اسے کس طرح سے روکا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد ابن خلدون مغرب میں روشناس ہوا، اور فلسفہء تاریخ کا اہم مفکر ٹھہرا۔

برصغیر ہندوستان میں مغل دور کا اہم مفکر ابوالفضل تھا، چونکہ ہمارے معاشرے کو اس کے افکار کی ضرورت نہیں، اس لئے وہ اب تک تاریخ کی کتابوں تک محدود ہے۔

لیکن ہم نے وقت کے تحت مذہبی شخصیتوں کو ضرور تاریخ سے نکال کر انہیں اپنے مفادات کے لئے استعمال کیا ہے، ان میں احمد سرہندی، المعروف مجدد الف ثانی کی شخصیت

ہے کہ جو اکبر کے دور میں اتنے زیادہ مقبول نہ تھے، ان کا زیادہ وقت جہاں گیر کے عہد میں گذرا، مگر مذہبی حلقوں نے انہیں اکبر کا حریف بنا کر بطور ہیرو پیش کر دیا، اور یہ ثابت کیا کہ انہوں نے اکبر کے مذہبی عقائد کا مقابلہ کیا، حالانکہ ان کے اپنے زمانے میں وہ کوئی بااثر مذہبی شخصیت نہیں تھے۔ مگر اب ان کے ماننے والوں میں ان کے لئے بے انتہا عقیدت ہے۔ پاکستان کی تاریخ نویسی میں وہ اب دوقومی نظریہ کے حمایتی بن کر ابھرے ہیں۔

یہی صورت شاہ ولی اللہ کی تھی، جن کا دائرہ بھی بڑا محدود تھا، مگر آزادی سے پہلے کے ماحول میں ان کی ضرورت کو محسوس کیا گیا، اور مولانا عبیداللہ سندھی نے انہیں ایک انقلابی کے طور پر پیش کیا۔ اب وہ بھی پاکستان کی تاریخ نویسی میں علماء کی سیاست کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔

اسی ضمن میں پاکستان میں اورنگ زیب کی شخصیت کو ابھارا گیا تاکہ اس کے مذہبی خیالات کی بنیاد پر مذہب اور سیاست کے ملاپ کو جائز قرار دیا جائے، حالانکہ خود اورنگ زیب نے اپنی مذہبی انتہا پسندی کے باوجود ایک خط میں یہ لکھا تھا کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں، انہیں ایک دوسرے سے ملانا نہیں چاہئے۔

جب وقت کے تقاضوں اور ضروریات کے تحت تاریخ کی ان شخصیتوں کو جدید زمانے میں لایا جاتا ہے تو ان کے اردگرد روایات کا ایسا جال بنا جاتا ہے کہ لوگ جذباتی طور پر ان سے جڑ جاتے ہیں اور انہیں اپنا راہنما اور مسیحا سمجھنے لگتے ہیں، اب اگر ان پر تنقید کی جائے، یا ان شخصیتوں کی کمزوریوں کو ظاہر کیا جائے، یا تاریخ میں ان کے کردار کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو ان کے ماننے والے مشتعل ہو جاتے ہیں، اور ان کے خلاف کچھ پڑھنے اور سننے پر تیار نہیں ہوتے ہیں، اس صورت حال میں سیاستداں، اور حکمراں خاص طور سے ان شخصیتوں کو استعمال کرتے ہیں کہ جو ان کے مفادات کو پورا کریں، اس مقصد کے لئے وہ لوگوں میں ان کا ایک امیج یا تصور بناتے ہیں کہ ان کے تاریخی کردار سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہندوستان میں شیواجی کی ہے کہ جس نے مغلوں کا مقابلہ کیا اور مراہٹہ سلطنت قائم کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا۔

لیکن وقت کے ہاتھوں شیواجی گمنامی میں چلا گیا، یہاں تک کہ اس کی سمادھی

جنگلوں میں گم ہوگئی۔ اس کی شکستہ اور خستہ حال سمادھی کو ایک انگریز جیمس ڈگلس نے دیکھا، جو کہ ''بمبئی پر ایک کتاب'' شائع شدہ 1883 کا مصنف تھا۔ اس نے توجہ دلائی کہ شیوا جی کی یہ یادگار ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو رہی ہے۔ اس نے راناڈے اور تلک جو مہاراشٹر کے سیاسی راہنما تھے، ان کو یہ موقع دیا کہ شیوا جی کو دوبارہ سے تاریخ سے نکال کر اسے مہاراشٹر نیشنل ازم کی علامت بنائیں اور لوگوں میں سیاسی شعور کو ابھاریں، چنانچہ اس کے بعد سے شیوا جی بطور ہیرو ابھرا، راج گڑھ جو اس کا کیپٹل تھا، وہاں اس کی یاد میں جلسے ہونے لگے، اس پر کتابیں لکھی گئیں، اور مغلوں کی حکومت کے خلاف مزاحمت کا نشان بنا کر اسے ''چھتر پتی'' کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد سے اب تک کتابوں، پمفلٹوں، مضامین کے ساتھ ساتھ اس پر گانے، نظمیں لکھی گئیں، فلمیں بنائی گئیں، اور فرقہ وارانہ دور میں وہ ہندوؤں کا عظیم ہیرو بن کر ابھرا کہ جس نے مغل حکومت کی جڑیں ہلا دی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراشٹر میں لوگوں میں شیوا جی کا امیج، عوامی لیڈر کے طور پر ابھرا کہ جس نے مراہٹہ قوم کے لئے جدوجہد کی، اب اگر کوئی مورخ یا دانشور اس نقطہء نظر سے اختلاف کرتا ہے تو اس کو اپنا دفاع کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ لوگوں کا جذباتی طور پر اس قدر لگاؤ ہو گیا ہے کہ وہ اس کے خلاف کچھ بھی سننے کو تیار نہیں۔ جب سماج میں یہ صورت حال ہو جائے تو پھر تاریخ میں تحقیق کے راستے رک جاتے ہیں۔

چنانچہ یہی ہوا، ایک امریکی مورخ جیمس لین نے شیوا جی پر ایک کتاب ''ہندو بادشاہ، مسلم ہندوستان میں''، لکھی، جس میں شیوا جی پر تنقید کر دی، اس کے نتیجہ میں مہاراشٹر میں زبردست ہنگامہ ہوا، اور ایک مجمع نے پونہ میں بھنڈا کر انسٹی ٹیوٹ پر حملہ کر دیا، کیونکہ لین نے یہاں بیٹھ کر تاریخی دستاویزات کی مدد سے یہ کتاب لکھی تھی، یہ حملہ شیوا جی کے بیٹے سمبھا جی کے نام پر بنائی گئی ایک جماعت نے کیا اور انسٹی ٹیوٹ میں سنسکرت کے مسودوں کو آگ لگا دی، ساتھ ہی بک سیلرز کو دھمکی دی گئی کہ وہ یہ کتاب فروخت نہ کریں، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے جس نے یہ کتاب چھاپی تھی، اسے وقتی طور پر واپس لے لیا۔

یہ صورت حال جو ہندوستان میں ہوئی، بہت سے ترقی پذیر اور پس ماندہ معاشروں میں روزمرہ کا معمول ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جب

ان تاریخی شخصیتوں کو دوبارہ سے تشکیل دی جاتی ہے اور انہیں ماضی سے نکال کر حال کی ضرورت کے تحت واپس لایا جاتا ہے تو ان کی تاریخی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اور وہ ایک نئی شکل اور حلیہ میں سامنے آتے ہیں کہ جو سیاستدانوں، اور لوگوں کے مفادات کو پورا کرتے ہیں۔ شخصیت پرستی کے اس عمل میں لوگوں کو اس قدر جذباتی بنا دیا جاتا ہے کہ ان کی سوجھ بوجھ، عقل اور شعور سب ختم ہو جاتا ہے، اور شخصیت کے سحر میں انہیں جس راستے پر لے جایا جائے وہ چل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے شخصیت پرستی، جمہوریت کی راہ میں بھی رکاوٹ ہوتی ہے، یہ آزادی فکر کو بھی روکتی ہے، اور اس کے نام پر جماعتیں یا گروپس لوگوں پر حکومت کرتے ہیں۔ جب شخصیت پرستی تاریخ کو مسخ کر دے، واقعات کو بدل دے، اور اسے مفادات کے تحت تشکیل دے کر لوگوں میں مقبول بنائے، تو اس صورت میں تاریخی و سیاسی شعور دونوں مجروح ہو جاتے ہیں۔

شخصیتیں اور افکار

تاریخ میں شخصیتوں کے کئی کردار ہوتے ہیں، یہ سیاسی وسماجی اور معاشی کردار بھی ادا کرتی ہیں، اور نئے خیالات وافکار بھی تخلیق کرتی ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی بھی شخصیت کے تاریخی کردار یا اس کے خیالات وافکار کو ہمیشہ کے لئے تسلیم کرلیا جائے، یا انہیں وقت کی ضرورت کے لحاظ سے دیکھا جائے، اور ہر آنے والی نسل اپنے عہد اور تقاضوں کے مطابق فیصلے کر سکے۔

پاکستان کے معاشرے میں چونکہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت نہ تو نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں، اور نہ ہی ایسے افراد جو حالات کو دیکھتے ہوئے نئے راستے تلاش کریں، اس لئے عام طور پر ہمارے ہاں ماضی کی شخصیات ہی ہماری راہنما بن جاتی ہیں، اور ہم ان کے فرسودہ اور غیر متوازن افکار پر بھروسہ کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سماج ایک جگہ ٹھہر کر رہ جاتا ہے اور اس میں تخلیقی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

ماضی کی شخصیات سے راہنمائی کا ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ تو دانشور اور مفکر ایسے ہوتے ہیں کہ جو تسلسل کے ساتھ ایک فکر کا شعور دیتے ہیں، مگر ایسی بہت سی شخصیات ہیں کہ جن کے ہاں متضاد خیالات وافکار پائے جاتے ہیں، جن کی وجہ سے مختلف فکر کے گروپوں اور سیاسی جماعتوں کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ ان کو اپنا لیں، اور ان کے خیالات کی مدد سے اپنے سیاسی یا سماجی مقاصد کی تکمیل کریں۔ مثلاً ہم علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح کی مثال دیں گے۔ اقبال کے ہاں فکر کے بے انتہا تضادات ہیں۔ وہ ہندوستانی قوم پرست بھی ہیں، تو پان اسلام کے علم بردار بھی، جمہوریت کے مخالف بھی ہیں، تو جمہوریت کے حامی بھی، اگر ایک جگہ وہ مسولینی کی تعریف کرتے ہیں تو دوسری جگہ اطالوی

سامراجیت پر طرابلس کے معرکہ پر نوحہ بھی لکھتے ہیں، لہٰذا ان کی شاعری میں تضادات بہت ہیں، اب اقبال کا سہارا لے کر کچھ سوشلسٹ دانشوروں نے علامہ کو سوشل ازم کا حامی ثابت کر دیا، تو اس کے مقابلہ میں کچھ نے انہیں اسلام کا علم بردار بنا دیا۔

یہی صورت حال قائداعظم محمد علی جناح کی ہے کہ ایک طرف ترقی پسند ان کی 11-اگست والی تقریر کی مدد سے انہیں سیکولر ثابت کر رہے ہیں، تو دوسری جانب مذہبی لوگ ان کی تقاریر کی مدد سے انہیں راسخ العقیدہ مسلمان بنا کر پیش کر رہے ہیں، اور انہیں اپنا کر ان کی تقاریر کی مدد سے اپنے سیاسی ایجنڈے کو مقبول بنا رہے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کوئی سماج یا معاشرہ شخصیتوں کا محتاج کیوں ہوتا ہے؟ وہ کیوں اپنے خیالات و افکار یا منصوبوں کے لئے ان کا سہارا لیتے ہیں؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ جن نظریات کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں، ان کو ثابت کرنے، یا لوگوں کو یقین دلانے کے لئے ان کے پاس دلائل نہیں ہوتے ہیں، اس لئے وہ شخصیتوں کا سہارا لے کر اپیل کرتے ہیں کہ چونکہ انہوں نے اس کو درست اور صحیح قرار دیا تھا، اس لئے اسے تسلیم کر لینا چاہئے، اور اس پر نہ تو تنقید کرنی چاہئے اور نہ اسے چیلنج کرنا چاہئے۔ یہ طریقہ اس لئے درست نہیں کہ اس کے ذریعہ لوگ کسی بھی فکر، نظام، یا نظریہ کے بارے میں پوری طرح سے واقف نہیں ہوتے ہیں، اور اسے اپنی پسندیدہ یا قابل احترام شخصیت کے سہارے قبول کر لیتے ہیں، اس لئے ان میں سیاسی و فکری شعور پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اس کے برعکس ایک دوسرا طریقہ کار ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کو کسی فکر اور نظام کے بارے میں بنیادی آگہی دی جائے، مثلاً جمہوریت، سیکولرازم، امپیریل ازم، اور قوم پرستی وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ افکار، یا نظام کسی ایک شخصیت کے مرہون منت نہیں ہوتے ہیں، ان کے ارتقاء، ترقی اور ترتیب و تنظیم میں کئی نسلوں کا تجربہ اور ذہنی کاوشیں ہوتی ہیں، لہٰذا لوگوں کو بنیادی طور پر یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ جمہوریت کیا ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں؟ اور اس سے سماج کو آگے بڑھنے کے مواقع ملتے ہیں، تو لوگ اس کی بنیاد اور روح سے واقف ہوں گے۔ اسی طرح سے دوسرے نظریات کو سماج کی پس منظر میں رکھ کر ان کی بات کی جائے، تو اس سے لوگوں میں سوجھ بوجھ، فکر اور شعور پیدا ہوگا اور وہ اس قابل ہوں گے

کہ اپنے فیصلے خود کریں۔

کسی بھی سماج کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں میں علم و دانش و آگہی ہو، تا کہ وہ شخصیتوں کے سہاروں پر نہیں رہیں، اور اپنے فیصلے خود کرسکیں۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ فلاں شخصیت نے ایک مرتبہ کہا کہ سیکولرازم اچھا ہے، اس لئے ہم سب کو سیکولر ہو جانا چاہئے، یا کسی دوسرے موقع پر کہہ دیا کہ سرمایہ دارانہ نظام سب سے بہتر ہے، تو ہمیں اس کی حمایت کرنی چاہئے۔ یہ طریقہ کار لوگوں کو پابند کر دیتا ہے، وہ اس قابل نہیں ہوتے ہیں کہ کسی فکر، یا نظام کے بارے میں پوری معلومات حاصل کریں اس کے مثبت و منفی پہلوؤں کو دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ یہ ان کے لئے مفید ہے یا نہیں، یہ اسی وقت ممکن ہوگا کہ جب افکار و خیالات و نظریات اور کسی بھی نظام کو ان کی اصل بنیادوں کے مطابق سمجھیں گے۔ اس عمل کے نتیجہ میں وہ جس فیصلے پر پہنچیں گے کہ شعوری ہوگا، اور اس پر معاشرہ پوری طرح سے عمل پذیر ہوگا۔

مثلاً ہمارے ہاں اس وقت دائیں اور بائیں بازو کی جماعتوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ ملک میں سیکولرازم ہونا چاہئے یا نہیں۔ اب اگر قائداعظم کے حوالہ سے اس کو ثابت کیا جائے تو اس قدر بااثر نہیں ہوگا، کیونکہ دائیں بازو کے لوگ ان ہی کے حوالوں سے اس کی نفی کر دیں گے، اس لئے اگر سیکولرازم کیا ہے؟ اس کی بنیادیں کیا ہیں؟ اور اس کے کیا مثبت اثرات ہوں گے؟ اگر بحث کو اس نہج پر لایا جائے تو لوگوں پر سیکولرازم واضح ہو کر سامنے آئے گا اور انہیں اپنا فیصلہ کرنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

اورنگ زیب عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات 1707 میں ہوئی، اس کو اب 300 سال کا عرصہ گذر گیا ہے۔ جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا ہے تو ورثہ میں ایک بڑی ایمپائر چھوڑ کر گیا۔ لیکن اس کے جانشین اس کی وسیع اور پھیلی ہوئی سلطنت کو سنبھال نہیں سکے اور جلد ہی اس کا زوال شروع ہو گیا، جس کا خاتمہ بالآخر 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔

اورنگ زیب اپنی زندگی میں، اور وفات کے بعد ایک متنازع شخصیت بن گیا۔ خاص طور سے 1920 کی دہائی میں جب ہندوستان کی سیاست میں فرقہ واریت آئی، تو اس سے تاریخ نویسی بھی متاثر ہوئی، جس نے ہندو اور مسلمان نقطۂ نظر کو اس میں داخل کر دیا۔ لیکن فرقہ واریت کے ساتھ ساتھ دوسرے نقطہائے نظر نے بھی اس کی شخصیت کو تنقیدی نظر سے دیکھا۔ ایک دلیل کے تحت اسے مغل سلطنت کے زوال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا کہ جس کی مذہبی انتہا پسندی اور تعصب کی پالیسی نے ہندوؤں کو مخالف بنا دیا، اور وہ اشتراک کہ جو اکبر نے پیدا کیا تھا، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن اس کے مداحین کی بھی خاصی تعداد ہے جو اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں۔ وہ اسے ایک منتظم بادشاہ کہ جس نے پوری سلطنت کو کنٹرول کر رکھا تھا، اور بحرانوں پر قابو پا رکھا تھا، اس حیثیت سے دیکھتے اور اس کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ اس کے ذاتی کردار کے بھی مداح ہیں کہ جس میں پرہیز گاری، تقویٰ اور دین سے محبت شامل تھی۔ یہ خوبیاں اسے پیر باصفا بنا دیتی ہیں۔ یہ مورخین بھائیوں کے قتل کی بھی تاویل پیش کرتے ہیں کہ اس نے اس عمل سے ملک کو خانہ جنگی اور خوں ریزی سے بچا لیا۔

اگرچہ پاکستان میں اورنگ زیب پر کوئی تحقیقی کام تو نہیں ہوا، لیکن مذہبی حلقوں میں اس کا کردار بطور ماڈل پیش کیا جاتا ہے کہ جس نے برصغیر ہندوستان میں اسلام کی

خدمت کی، اور اکبر و دارا شکوہ کے نظریات و افکار کے خلاف جدوجہد کی۔ ان کے نزدیک اکبر اور دارا شکوہ ہندوستان میں ایک مشترک کلچر کو فروغ دینا چاہتے تھے جو اسلام کے لئے خطرناک تھا، جب کہ اورنگ زیب نے مشترک کلچر سے اسلام کو علیحدہ کر کے برصغیر کی مسلمان جماعت کی شناخت کو برقرار رکھا۔

ہندوستان میں جادو ناتھ سرکار کے بعد، دوسرے مورخوں نے اورنگ زیب کے دور حکومت اور اس کی شخصیت کا مطالعہ کیا ہے، کیونکہ آزادی کے بعد ہندوستان میں ہندو انتہا پسند اورنگ زیب کو ہر بحران اور برائی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس لئے سیکولر اور قوم پرست مورخین نے اس کے دور حکومت کا تجزیہ سیاست اور طاقت کے فریم ورک میں کیا ہے کہ جس میں وہ ایک جانب مذہب کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے، مگر جہاں اس کی ضرورت نہیں وہ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے۔ جب سنی امراء اس سے کہتے ہیں کہ شیعوں کو اعلیٰ عہدوں سے نکال دیا جائے، تو اس کا جواب تھا کہ مذہب اور سیاست دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، انہیں ایک دوسرے سے ملانا نہیں چاہئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیعہ امراء انتظامیہ کا تجربہ رکھتے تھے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان کے تجربات سے محروم ہو جائے۔

اسی طرح اورنگ زیب نے گجرات، بنارس، ٹھٹھہ اور متھرا میں ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کرایا۔ اس کے حامی اس کے اس اقدام کو درست قرار دیتے ہوئے دلیل دیتے ہیں کہ یہ مندر سازشوں کا گڑھ بن گئے تھے، اس لئے ان کو بطور سزا گرایا گیا۔ لیکن اس کی کوئی شہادت نہیں ہے۔ اس پر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا عمارتوں کے گرانے سے سازشیں ختم ہو جاتی ہیں؟ اگر سزا دینی تھی تو سازشیوں کو دی جاتی۔ مندروں کو مسمار کر کے وہ دراصل اکبر کی صلح کل کی پالیسی سے انحراف کر رہا تھا کہ جس کے تحت ہندو اور مسلمان دونوں بادشاہ کی رعایا تھے اور ایک ہی سلوک کے مستحق تھے۔ اس کا مقصد تھا کہ اس کی ہندو رعایا اس پیغام کو سمجھ لے کہ حکومت صلح کل اور اشتراک کے بجائے علیحدگی کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔

لیکن مندروں کے مسمار کرنے کے ساتھ ساتھ، اس نے مندروں کو عطیات بھی دیئے۔ حال ہی میں اورنگ زیب کے ایسے فرامین دستیاب ہوئے ہیں کہ جو اس نے ہندو،

سکھ مذہب اور جین مت کے مندروں کو نقد، عطیات یا زمین کی صورت میں ان کی دیکھ بھال کے لئے جاری کئے تھے۔ دکن میں جہاں اس نے اپنی زندگی کے آخری سال گذارے وہاں اس نے کوئی مندر مسمار نہیں کیا، کیونکہ سیاسی طور پر یہ اس کے مفاد میں نہیں تھا کہ مندروں کو گرا کر وہاں کے لوگوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرے۔ اسے ان کی حمایت کی ضرورت تھی۔ اس لئے شمالی ہندوستان کے مقابلہ میں جنوبی ہندوستان میں اس کی پالیسی مختلف رہی۔

اس کی مذہبی انتہا پسندی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے غیر مسلموں پر جزیہ لگا کر، ان میں فرق پیدا کیا۔ ہندوستان کے ایک مورخ ستیش چندرا کا کہنا ہے کہ جزیہ کا نفاذ اس نے 1679 میں کیا، یعنی اپنی تخت نشینی کے 22 سال بعد۔ اس کی وجہ بتاتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ وہ وقت تھا کہ جب اس کے تعلقات راجپوت حکمرانوں سے بگڑ رہے تھے، ساتھ ہی میں اسے دکن کی ریاستوں سے جنگ کرنی تھی، لہٰذا اسے مسلمان جماعت کی حمایت چاہئے تھی۔ لیکن اس کی یہ پالیسی کامیاب نہیں رہی، کیونکہ جزیہ جمع کرنے والے افسر بدعنوان اور نااہل ثابت ہوئے، جس نے مزید خرابیوں کو پیدا کیا، اس لئے اس نے 1704 میں جزیہ کو ختم کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ بھی اس کی سیاسی مجبوری تھی، جس کا مذہب سے کوئی زیادہ تعلق نہیں تھا۔

اگرچہ اورنگ زیب بذات خود سادگی پسند تھا، اور کسی عیاشی یا بدعنوانی میں ملوث نہیں رہا۔ لیکن اس کی ذات کی پرہیز گاری کا اثر اس وقت کے امراء اور حکمراں طبقوں پر کچھ نہیں ہوا۔ تقریباً اس کے تمام منصب دار بدعنوان اور عیاش تھے۔ اس کے جنرلز مرہٹوں سے رشوت لے کر قلعوں کے محاصروں کو طول دیتے تھے اور جنگ سے گریز کرتے تھے۔ ریاست کے عہدے دار عوام میں بے انتہا غیر مقبول تھے، کیونکہ وہ لوگوں کے ساتھ نہ صرف برا برتاؤ کرتے تھے، بلکہ ان کو لوٹتے بھی تھے۔ اس کے دربار کا قاضی القضات عبدالوہاب رشوت خوری اور بدعنوانی میں مشہور تھا۔ امراء میں شراب نوشی اور جنسی بے راہ روی پھیلی ہوئی تھی۔ اورنگ زیب اپنے دربار اور امراء کے ان رویوں کی نہ تو اصلاح کر سکا اور نہ ان کو روک سکا۔

اگرچہ اس نے اپنی سلطنت کو وسعت تو دی، مگر وہ صوبوں میں ابھرتی ہوئی تحریکوں اوران کی طاقت کونہیں سمجھ سکا، راجپوت، مرہٹہ، جاٹ اور سکھ طاقتیں اسی دور میں ابھریں جوحکومت کے مرکزی نظام سے بغاوت کر کے اپنا حصہ چاہتی تھیں۔ جب ان کے خلاف طاقت کواستعمال کیا گیا تو اس نے صوبوں کی وفاداری کوختم کر دیا، مغل سلطنت سے ان کا لگاؤ بھی ٹوٹ گیا، یہ مغل سلطنت کے زوال کی ابتداء تھی۔ اورنگ زیب نے اس کواپنی زندگی تک روکے رکھا، مگراس کی وفات کے بعد یہ سیلاب سلطنت کو لے ڈوبا۔

بھگت سنگھ کی یاد میں

(بھگت سنگھ 1907 میں پیدائش اور 1931 میں پھانسی کی سزا)

1947 میں صرف برصغیر ہندوستان ہی کی تقسیم نہیں ہوئی، بلکہ اس کی ماضی کی تاریخ کو بھی تقسیم کر دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہندوستان اور پاکستان میں تاریخ کو دو مختلف نقطہ ہائے نظر سے بیان کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے دونوں ملکوں میں تاریخ کے بارے میں مختلف نظریات ابھر رہے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ نویسی میں زیادہ زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ تحریک پاکستان میں کیوں کر جدوجہد کی گئی اور اس میں کس طرح سے بالآخر کامیابی ہوئی، اس ضمن میں کولونیل ازم اور اس کے اثرات پر تنقید کم ہی کی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ تمام تحریکیں اور افراد کہ جنہوں نے کولونیل ازم کے خلاف جدوجہد کی وہ ہماری تاریخ کا حصہ نہیں رہے۔ اسی کا ایک حصہ سردار بھگت سنگھ ہے۔

بھگت سنگھ ایک انقلابی نوجوان تھا، جو نہ صرف انقلاب کے ذریعہ سماج کو تبدیل کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس کا مقصد تھا کہ ایک ایسا انقلاب لانا چاہئے کہ جس میں عام آدمی کی زندگی بہتر ہو اور اسے استحصال اور مظالم سے نجات مل سکے۔ اس نے آزادی اور انقلاب کی اس وقت جدوجہد کی کہ جب برصغیر ہندوستان میں اور دوسری تحریکیں چل رہیں تھیں۔ وقت گزرنے کے بعد اب اس کے انقلابی کردار کو کئی انداز سے دیکھا جاتا ہے، سیاسی جماعتیں، اور مختلف گروپس اس کے بارے میں علیحدہ علیحدہ آراء رکھتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں کانگرس پارٹی اس کو آزادی کی خاطر لڑنے والا تو تسلیم کرتی ہے، مگر اس کے انقلابی کردار کے بارے میں خاموشی اختیار کر لیتی ہے، کیونکہ یہ پہلو اس کی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ مگر اس کی ہردلعزیزی کے سبب وہ اس کو علیحدہ بھی نہیں کر پاتی ہے اسی طرح سے دائیں بازو کی جماعتیں اس کی وطن پرستی اور حب الوطنی کی تعریف کرتی ہیں، مگر جب اس کے فرقہ وارانہ نظریات اور طبقاتی کش مکش کا ذکر آتا ہے تو اسے نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔

پاکستان میں بھگت سنگھ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ اسے پنجاب میں قوم پرست تو بطور ہیرو تسلیم کرتے ہیں، لیکن پاکستان کے دوسرے صوبوں یعنی سندھ، بلوچستان اور سرحد میں اس کے بارے میں لوگوں کو بہت کم معلومات ہیں۔ اس کا ذکر نہ تو ہماری نصاب کی کتابوں میں ہے اور نہ ہی تحریک پاکستان یا جدوجہد آزادی میں۔

اگر کوئی بھگت سنگھ کو بطور انقلابی تسلیم کرتا ہے تو وہ بائیں بازو کی جماعتیں ہیں، جو اس کے انقلابی خیالات کو فروغ دینا چاہتی تھیں، اور اس کی طبقاتی جدوجہد کو جاری رکھنے کا عزم کرتی ہیں۔ انہوں نے اس کی یاد میں اس کی 100 سالہ سالگرہ میں کچھ جلسے، سیمینار اور کانفرنسیں کیں اور اس کی یاد کو برقرار رکھا۔

بھگت سنگھ کے کردار اور اس کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی شخصیت کے دو پہلو بہت اہم رہے ہیں۔ اول وہ دہشت گردی کے ذریعہ کولونیل حکومت کو خوف زدہ کرنا چاہتا تھا، دوئم انقلابی خیالات کے ذریعہ وہ نوجوان نسل کو آزادی اور سماج کو تبدیل کرنے کے لئے ابھارنا چاہتا تھا۔ ان دونوں کا مقصد یہ تھا کہ جب ملک غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو تو یہاں ایک ایسا سماج تشکیل پائے کہ جس میں عام لوگ ظلم و ناانصافی سے نجات پا کر سکون و آرام سے رہ سکیں۔

برصغیر ہندوستان میں دہشت گردی کی ابتداء 1905 میں تقسیم بنگال کے نتیجہ میں ہوئی، جب اس تقسیم کے خلاف تحریک کی ابتداء ہوئی اور تمام پُرامن طریقوں کے ذریعہ کامیابی حاصل نہیں کی جا سکی، تو اس مرحلہ پر ایسی خفیہ جماعتیں وجود میں آئیں کہ جنہوں نے تشدد اور دہشت گردی کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ یہ جماعتیں 19 ویں صدی میں جرمنی، اٹلی اور روس میں ان خفیہ جماعتوں سے متاثر تھیں کہ جنہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں غیر ملکی اقتدار اور مطلق العنان حکومتوں کے خلاف تشدد کو اختیار کیا تھا۔ اس وقت تشدد کی کارروائیاں صرف ان افراد کے خلاف ہوتی تھیں کہ جو حکومت کے اعلیٰ عہدے دار اور حکمراں طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اور جن کی عوام دشمنی کا سب کو علم ہوتا تھا، ان کے خلاف کارروائی کا مقصد یہ تھا کہ یہ ایسی پالیسیوں سے گریز کریں کہ جو عوام کے مفاد میں نہیں ہیں۔ اس لئے یہ افراد کو نشانہ بناتے تھے، انہیں قتل کرتے تھے یا انہیں ڈراتے دھمکاتے تھے،

تا کہ وہ اپنے طریقہ حکومت کو تبدیل کریں۔

بنگالیوں نے تقسیم کے بعد اسی پالیسی کو اختیار کیا اور برطانوی حکومت کے اعلیٰ عہدے داروں کو تشدد کے ذریعہ ڈرایا، خوف زدہ کیا، اس کی وجہ سے بالآخر 1911 میں تقسیم بنگال کو ختم کرنا پڑا۔ یہ انقلابی خفیہ جماعتوں کی بڑی کامیابی تھی۔

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو انگریز پولیس افسر کے قتل اور سینٹرل اسمبلی میں بم پھینکنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ جب وہ جیل میں تھا تو اس نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا، حالات کو سمجھنے اور انقلابی نظریات کا شعور پختہ کرنے کی غرض سے اس نے انقلابی ادب کا مطالعہ کیا۔ اس کے ذہن میں جو خیالات آئے وہ اس نے قلم بند کئے۔ حال ہی میں چمن لال نے بھگت سنگھ کی تمام تحریروں کو جمع کر کے شائع کر دیا ہے، ان میں اس کا وہ بیان ہے کہ جو اس نے عدالت میں دیا تھا، جیل کی ڈائری ہے، اور مضامین میں دہریا کیوں ہوا، بہروں کو سننے کے قابل بنانا، اور خودکشی کے بارے میں اس کی تحریر، کتاب کا نام ہے، ''جیل ڈائری اور دوسری تحریریں۔''

بھگت سنگھ کے مقدمہ کی بڑی تشہیر ہوئی۔ گاندھی جی نے اس مقدمہ پر خاموشی اختیار کی، کیونکہ وہ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی تشدد کی کارروائیوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ جبکہ قائداعظم محمد علی جناح نے بھگت سنگھ کی حمایت کرتے ہوئے برطانوی حکومت پر سخت تنقید کی کہ اس کی پالیسیوں کی وجہ سے نوجوان اس حد تک پہنچے۔ بھگت سنگھ نے جیل کے دن انتہائی جرأت سے گذارے، اور اسی جرأت کے ساتھ وہ پھانسی کے تختہ پر چڑھ گیا۔ یہی جرأت اور بہادری ہے کہ جو اسے بطور انقلابی زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اس مرحلہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آج ہم کیوں بھگت سنگھ کو یاد کریں؟ اور کیوں اس کے ورثہ کی بات کریں؟ اس کے نظریات کا جو ورثہ ہم تک پہنچا ہے، اس میں کچھ ایسے ہیں کہ جن کی آج بھی ضرورت ہے، اور کچھ ایسے ہیں کہ جو وقت کے ساتھ بدل گئے ہیں۔

مثلاً سب سے پہلے تو اس کے مقصد کی تعریف کرنا چاہئے کہ جو اس کے پیش نظر تھا، یعنی آزادی۔ اس کی خاطر اس نے اپنی جان کی قربان دیدی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان غیر ملکی اقتدار سے چھٹکارا پالے، اور کولونیل ازم کے استحصالی نظام سے نجات

حاصل کر لے۔ اگر انڈیا اور پاکستان اب آزاد ممالک ہیں، لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ابھی تک وہ مکمل طور پر آزاد نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ اب تک بیرونی ملکوں کے زیر اثر ہیں، اور بین الاقوامی اداروں کے موجودہ دور میں تشدد یا دہشت گردی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی اس کے ذریعہ برطانوی حکمراں طبقوں میں خوف و ہراس پیدا کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان کے عوام کو یہ تاثر دینا بھی ان کا مقصد تھا کہ برطانوی ایمپائر کوئی ناقابل شکست نہیں ہے، لہٰذا دلوں سے اس کے ڈر اور خوف کو نکال دینا چاہئے۔ وہ کبھی بھی عام شہریوں کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے تھے۔ موجودہ زمانے میں امپیریل طاقتیں، ریاستیں اور عسکریت پسند تنظیمیں تشدد اور دہشت گردی کے ذریعہ عام شہریوں کا قتل عام کر رہی ہیں۔ اس وجہ سے دہشت گردی کی شکل بدل گئی ہے۔ اب لوگ اس کا نشانہ ہیں، جس کی وجہ سے اس کے اثرات بھی منفی ہو رہے ہیں۔

لیکن بھگت سنگھ کا اولین مقصد یہ تھا کہ سماج کا طبقاتی نظام جو ناانصافی اور ظلم پر ہے، اسے بدلا جائے۔ اس نے اپنے ایک مضمون میں اس کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ لوگوں میں اس تبدیلی کے احساس کو بیدار کیا جائے کہ جوان کی زندگی کو بہتر بنائے۔ عام طور سے لوگ روایات سے اس قدر جڑے ہوتے ہیں کہ وہ انہیں تبدیل کرنے پر تیار نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے اس احساس، کمزوری اور روایت پسندی کو توڑنا بہت ضروری ہے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ جب ان میں انقلابی روح کو پیدا کیا جائے۔

بھگت سنگھ کا یہ ورثہ آج بھی وقت کی ضرورت ہے۔ خاص طور سے اس مرحلہ پر جب امیر و غریب کا فرق ہمارے سماج میں برابر بڑھ رہا ہے۔ امارت اور غربت و افلاس کے درمیان زبردست خلیج حائل ہو رہی ہے، اس لئے جب تک اس طبقاتی مسئلہ کو حل نہیں کیا جائے گا، سماج میں امن و امان کا قائم رکھنا مشکل ہوگا۔ اس لئے اس مسئلہ کے حل کے لئے دو راستے ہیں: یا تو انقلاب کے ذریعہ اسے تبدیل کیا جائے، یا دستوری اصلاحات سے اس کا خاتمہ کریں۔ اگر دستوری جدوجہد ناکام ہو جائے گی تو لازماً نوجوان نسل تشدد کے راستے کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگی۔ اس لئے تاریخ کا سبق یہ ہے کہ سماج میں جمہوری روایات اور اداروں کو مستحکم کیا جائے، جو لوگوں کو اختیارات دے کہ وہ تبدیلی کے عمل کو اپنی جانب موڑ دیں۔

امپیریل ازم اور اس کے حامی

امپیریل ازم، چاہے پرانا ہو یا نیا، اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا ہے کہ جب تک اسے مقبوضہ ملکوں میں تعاون کرنے والے، ساتھ دینے والے، اور اس کے اقتدار کو قائم کرنے والے نہ ہوں، کیونکہ صرف فوجی طاقت وقوت سے کسی غیر ملک پر زیادہ عرصہ قابض نہیں رہا جا سکتا ہے، اور لوگوں کی مزاحمت کو جب کچلا جاتا ہے تو اس میں فاتح قوم کو بہت زیادہ مالی اور جانی نقصان ہوتا ہے، اس لئے کسی ملک پر حملے سے پہلے یا حملے کے بعد امپیریل طاقت، فوری طور پر اپنے حامیوں کی تلاش کرتی ہے، اسے یہ حامی کسی نہ کسی شکل میں مل جاتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو اپنی حکومتوں سے ناراض ہوتے ہیں، یا ان کے ظلم وستم کا شکار ہوتے ہیں، یہ آنے والی طاقت کا ساتھ دے کر اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنی جائیداد اور مراعات کو بچانے کے لئے نئی طاقت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان میں موقع پرست بھی ہوتے ہیں کہ جو نئی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لئے امپیریل طاقتوں کا سہارا بن جاتے ہیں۔ اور ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو اس دلیل کے ساتھ نئے حکمرانوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے ملک اور قوم کو فاتح لوگوں کے ظلم وستم سے بچالیں گے اور ان کی مدد سے ملک میں امن وامان قائم کریں گے۔

تعاون کرنے والوں کی یہ مثالیں ہمیں تاریخ میں ہر اس امپیریل طاقت کے پھیلاؤ میں ملتی ہیں کہ جس نے دوسرے ملکوں پر حملے کئے اور وہاں قابض ہو کر اپنا اقتدار قائم کیا۔ یونانی، ایرانی، اور رومیوں کے سیاسی پھیلاؤ اور امپیریل ازم میں ہمیں یہ مثالیں ملتی ہیں۔ جب عربوں نے ایران پر حملہ کیا اور وہاں قابض ہوئے تو، ایران کے زمیندار یا دہقان طبقہ نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی حکومت کو مستحکم کرنے میں مدد دی۔ جب محمد بن

قاسم سندھ میں آیا ہے تو یہاں بھی قبائل کے سرداروں نے اس کا ساتھ دیا، اس نے برہمنوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ان کی قدیم مراعات کو بحال رکھا۔

یہی صورت ہم یورپی امپیریل ازم کے پھیلاؤ میں دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کا ساتھ دینے والوں میں اول تو تاجر طبقہ تھا کہ جنہیں ان کے ساتھ مل کر تجارت میں فائدہ ہو رہا تھا۔ اس کے بعد وہ امراء اور طبقہ اعلیٰ کے لوگ تھے کہ جو ان کی مدد سے اقتدار میں آنا چاہتے تھے، جیسے بنگال میں میر جعفر اور اس کے ساتھی، جنہوں نے سراج الدولہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ سندھ میں جب انگریز آئے تو سیٹھ ناؤمل نے ان کے ساتھ تعاون کیا، کیونکہ سندھ کے امیروں نے اس کے باپ کے ساتھ برا سلوک کیا تھا اور وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا تھا، مزید بحیثیت تاجر کمیونٹی کے سندھ کے ہندوؤں کے لئے کمپنی کی حکومت زیادہ سودمند تھی، اس لئے وہ اس کے حامی بن گئے۔

جب ایک مرتبہ برطانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا تو اب اس کے لئے تعاون کرنے والوں کی کمی نہ تھی، اس کی فوج میں عام فوجی ہندوستانی تھے جو وفاداری کے جذبہ سے اس کی ملازمت کر رہے تھے۔ والیان ریاست تھے جو اس لئے اس کے حامی تھے کہ کہیں ان کی ریاستوں کو ختم نہ کر دیا جائے۔ زمیندار اور جاگیردار تھے کہ جو اپنی مراعات اور جائیدادوں کے تحفظ کے لئے ان کے ساتھ تھے۔ یہ وہ طبقات تھے کہ جنہوں نے برطانوی امپیریل ازم کے پھیلاؤ میں پورا پورا ساتھ دیا۔ جب برطانوی حکومت نے دوسرے ملکوں پر حملے کئے اور اسے مالی امداد کی ضرورت ہوئی تو والیان ریاست اور زمینداروں نے اسے نہ صرف قرضے دیئے، بلکہ بھاری رقومات بطور چندہ دیں، جس کی وجہ سے حکومت کو اپنے خزانہ سے کم خرچ کرنا پڑا۔ جب اسے فوجیوں کی ضرورت ہوئی تو انہیں طبقات نے اپنے علاقوں سے لوگوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کر دیا، پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں پنجاب میں زمینداروں کے دلال گاؤں گاؤں پھرتے تھے اور نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کرتے تھے۔ یہ وہ غریب دیہاتی تھے کہ جنہوں نے برطانوی امپیریل ازم کے تحفظ اور پھیلاؤ کے لئے اپنی جانیں دیں، مگر ان کی قربانیوں کا ذکر تاریخ میں کم ہی ہے۔

ہندوستان میں برطانوی امپیریل ازم کو آہستہ آہستہ بہت سے طبقات میں

تعاون کرنے والے مل گئے۔ ان میں سے ایک گروہ کا کہنا تھا کہ انگریزوں کا ساتھ اس لئے دینا چاہیے کہ انہوں نے ہندوستان کو عہد وسطیٰ سے نکال کر جدید عہد میں داخل کر دیا ہے، ان کی وجہ سے نئی ٹکنالوجی آئی ہے، یورپی افکار و خیالات آئے ہیں، جس کی وجہ سے ہندوستان صنعتی و معاشی طور پر ترقی کر رہا ہے۔

ایک اور گروہ کی دلیل تھی کہ چونکہ اہل ہندوستان غیر مہذب، جاہل، پس ماندہ ہیں، اس لئے انہیں ضرورت ہے کہ ان پر کوئی مہذب قوم حکومت کرے تا کہ اس کی نگرانی میں یہ تہذیب سیکھ سکیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ ہندوستانی قوم میں کوئی جذبہ، لیاقت، صلاحیت اور آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں ہے، اس لئے امپیریل ازم سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے بلکہ اسے تسلیم کرلیا جائے اور اس سے جو فوائد حاصل ہوں انہیں حاصل کرلیا جائے۔

موجودہ دور میں امریکی امپیریل ازم نے ایک اور تاریخی ماڈل کو اختیار کیا ہے، اس میں ملک پر قبضہ کرنے کے بعد، کسی ایک ایسی شخصیت یا افراد کو چنا جاتا ہے کہ جو ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے حکومت کو سنبھالیں۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملک پر قبضہ نہیں اور اختیارات اس ملک کے باشندوں کے پاس ہیں، مگر درحقیقت ایسی حکومتیں اپنے عوام کے بجائے امپیریل طاقتوں کے مفادات پورے کرتی ہیں۔ موجودہ دور میں اس کی مثال عراق، افغانستان، اور فلسطین ہے کہ جہاں ابتداء میں انہوں نے یاسر عرفات سے کام لینے کی کوشش کی، مگر جب اس نے مزاحمت کی تو اسے ایک طرف کر کے بے بس بنا دیا۔ اب محمود عباس اسرائیلی اور امریکی مفادات کے لئے کام کر رہا ہے۔ افغانستان میں کرزئی کی یہی پوزیشن ہے اور یہی صورت حال عراق کی ہے۔

لیکن وقت کے ساتھ عوام میں جو سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے، اس میں یہ ماڈل ناکام ہو رہا ہے، کیونکہ یہ تمام لیڈر حضرات اپنے عوام میں مقبول نہیں ہیں۔ لیکن اس کا خمیازہ مقبوضہ ممالک کے عوام کو بھگتنا پڑتا ہے جو روز آگ و خون کی ہولی سے گذرتے ہیں، اور مزاحمت کے نتیجہ میں جانوں کی قربانی دیتے ہیں۔ تاریخ کا کام ہے کہ وہ ایسے تمام لوگوں کے کردار اور کاموں کو سامنے لائے کہ جنہوں نے امپیریل ازم کی حمایت کر کے اپنے ملکوں میں غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کیا۔

امپیریل ازم اپنے ہی عوام کا استحصال کرتا ہے

امپیریل ازم کے نظریہ کے تحت جب دوسرے ملکوں پر قبضہ کیا جاتا ہے، اوران کے ذرائع پر قابض ہوکران کا استحصال کیا جاتا ہے، تو اس کے پس منظر میں جو جذبات کارفرما ہوتے ہیں، ان میں ایک نیشنل ازم ہوتا ہے، اور دوسرا یہ کہ دوسرے ملکوں کے قبضہ میں نیک نیتی شامل ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ وہ ایک نیک مقصد کے لئے یہ جنگ لڑ رہے ہیں، امپیریل طاقتوں کو یہ ایک جواز فراہم کرتا ہے۔ ان جنگوں میں جنرلز اور حکمراں، فوراً ہی ہیروز کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں، اوران کے کارناموں کوان کی قوم میں بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا اور سراہا جاتا ہے۔

جب فتح ونصرت کی خبریں آتی ہیں، تو قوم کو جذباتی طور پر اس قدر مدہوش کر دیا جاتا ہے کہ وہ قطعی یہ نہیں سوچتی کہ اس فتح کی کیا قیمت انہیں دینا پڑی ہے۔ کیونکہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے۔ جب بھی جنگیں ہوتی ہیں، تو دونوں جانب سے فوجی اور شہری مارے جاتے ہیں۔ جب دوسرے ملک پر قبضہ کیا جاتا ہے تو اس قبضہ کو مستحکم کرنے اور یہاں کا انتظام سنبھالنے کی غرض سے قابض فوجی اور منتظمین اپنے کلچر اور ماحول سے جدا ہوکر، ایک غیر ملک میں، عدم تحفظ کی تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

کولونیل دور حکومت میں اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی طرح سے قابض طاقت کی کمزوری ظاہر نہ ہو، ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پالیسی تھی کہ اپنے ابتدائی دور میں یہ اپنے ملازموں کو 55 سال کی عمر میں ریٹائر کر کے واپس انگلستان بھیج دیتے تھے تاکہ اہل ہندوستان کسی بوڑھے انگریز کو نہ دیکھیں اوران کے نزدیک ہر انگریز جوان اور صحت مند نظر آئے، کیونکہ بوڑھا، زوال کی علامت ہوتا ہے، جبکہ جوان عروج اور طاقت کی۔ اس پالیسی کے تحت انگریزوں کی کئی نسلوں کو امپیریل مقاصد کے تحت قربان کیا جاتا رہا، تاکہ ان کی قربانی پر قوم کی عظمت اور شان وشوکت کی تعمیر ہو۔

ایک سوال جو امپیریل ازم کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں ابھرتا ہے وہ یہ کہ مثلاً جب

برطانیہ نے ایشیا وافریقہ کے ملکوں پر اپنا اقتدار قائم کیا اور وہاں کی دولت کو لوٹا، تو اس کا فائدہ کس کو ہوا؟ کیا اس کے نتیجہ میں برطانیہ کے عام لوگوں کو فائدہ ہوا، یا اس کا تمام فائدہ اس کے حکمراں طبقوں نے اٹھایا؟ انیسویں صدی برطانوی امپیریل ازم کے عروج کی صدی ہے، کہ جب دنیا کے ہر خطے سے دولت سمٹ کر یہاں آ رہی تھی، اس کے سہارے شاندار عمارتیں، اور یادگاریں تعمیر ہو رہی تھیں، تاجر اور صنعت کار کالونیز کی منڈیوں اور ان کے خام مال سے فائدہ اٹھا کر بے تحاشہ منافع کما رہے تھے، لیکن اس دور میں برطانیہ کے عام لوگ انتہائی مفلسی اور غربت کی زندگی گزار رہے تھے، انہیں اس مال غنیمت میں سے کچھ نہیں مل رہا تھا۔ اس صورت حال کا اندازہ انگریزوں کے تاریخ داں جی۔ ایم۔ ٹریولن (G.M.Trevelyan) کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں انگریزی زبان میں لفظ پاپر (Pauper) کا استعمال شروع ہوا۔ اس میں وہ کسان اور کاشتکار شامل تھے کہ جنہیں محنت و مزدوری کے باوجود گزارے کے لئے مشکل سے ملتا تھا اور فاقہ کی زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ اس اصطلاح میں ہاتھ سے کام کرنے والے مزدور بھی آتے تھے۔ جب ان لوگوں پر روزی کے دروازے بند ہو گئے تو انہوں نے 1830 میں اپنے مطالبات کے لئے ہنگامے کئے، نتیجتاً انہیں ہنگامہ کرنے والے اور فسادی کہا گیا، اور اس جرم پر مقدمہ چلایا گیا۔ انہیں جو سزائیں دیں، ان میں تین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، 120 کو بطور سزا آسٹریلیا بھیج دیا گیا کہ جہاں کھیتوں میں کام کرنے کے لئے سستی یا مفت مزدوری کی ضرورت تھی۔ بعد میں جب آسٹریلیا میں مزدوروں کی مانگ بڑھی تو اس پالیسی کو اختیار کیا گیا کہ لوگوں کو معمولی جرائم پر سزا کے طور پر وہاں جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔

مورخین نے تحقیق کے ذریعہ اب یہ ثابت کیا ہے کہ کولونیز اور صنعتی انگلستان میں مزدوروں کی زندگی ناگفتہ بہ تھی۔ وہ کچی آبادیوں میں رہتے تھے کہ جہاں نہ تو گندے پانی کے اخراج کا کوئی نظام تھا، اور نہ ہی صاف پینے کا پانی میسر تھا، کوڑے کے ڈھیر گلیوں میں سڑتے رہتے تھے، نہ مزدوروں کی ملازمت کا تحفظ تھا، نہ ان کی بیماری اور بڑھاپے میں ان کی مالی امداد کا تصور تھا۔ ان کے بچوں کے لئے نہ تعلیم کا انتظام تھا اور نہ صحت کے بارے میں کسی کو فکر تھی۔ وہ بیروزگاری کے خطرے کے تحت زندگی گزارتے تھے۔ عورتیں اور بچے 16، اور 17 گھنٹے بغیر کسی وقفہ کے کام کرتے تھے، اس وقت تک ہفتہ میں کسی ایک چھٹی کا بھی تصور نہیں تھا۔

فریڈرک اینگلز نے انیسویں صدی میں انگلستان کی ورکنگ کلاس کے بارے میں لکھا ہے کہ صنعتی ترقی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مزدوروں میں صحت مندی ختم ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جس ماحول میں کام کرتے ہیں، اس نے انہیں زرد اور کمزور کر دیا ہے۔ ان کی ہڈیاں سکڑ گئی ہیں، ان کی جلد لٹک گئی ہے، اس کمزوری کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں رہے ہیں کہ کسی بھی بیماری کا مقابلہ کر سکیں، اس لئے ہر بیماری انہیں دبوچ لیتی ہے اور یہ اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نوجوانی میں مر جاتے ہیں۔

ایک جانب تو کالونیز سے لوٹی ہوئی دولت سے امراء کا طبقہ دولت مند ہو رہا تھا، دوسری جانب صنعتی شہروں کا آلودہ ماحول اور کام کے اوقات مزدوروں کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھے۔ 1836 میں چارلس ڈکنز، انگریزی کے مشہور ناول نگار نے جب مانچسٹر کا دورہ کیا تو اس نے اس شہر کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ''میلوں تک آگ ہی آگ تھی، جو کہ فیکٹریوں میں بطور ایندھن جل رہی تھی، اس کے ساتھ ہی بھاپ کے انجنوں کا شور و غل تھا، وہاں گندگی، افسردگی، اور مفلسی کے ایسے ایسے مناظر تھے کہ جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔

مانچسٹر جانے والے ایک اور شخص کک ٹیلر (Cook Tylor) نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ مانچسٹر شہر کی تنگ و تاریک گلیاں اور اس کے تہہ خانوں میں غریب و نادار لوگ ان لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں کہ جن کے پاس دولت ہے، سماجی رتبہ ہے، یہ لوگ شہر کی کھلی فضا میں، عالیشان اور فیشن ایبل گھروں میں رہتے ہیں، ان کو اندازہ نہیں کہ جو لوگ کارخانوں، گوداموں، اور گندگی و غلاظت کے درمیان زندگی گزارتے ہیں، ان کے جذبات کیا ہوتے ہیں۔

ایک جانب تو مفلسی اور غربت کی یہ زندگی تھی، تو دوسری جانب انہیں اس بات کی آزادی نہیں تھی کہ وہ ٹریڈ یونین بنا سکیں، اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکیں، اپنی حالت زار کے بارے میں آگاہ کر سکیں۔ اگر وہ حالات سے مجبور ہو کر سٹرائیک کرتے تو اسے سختی سے کچل دیا جاتا تھا۔ 1844 میں جب مانچسٹر کے مزدوروں نے سٹرائیک کی تو ریاستی اداروں نے بے رحمی سے اس کے خلاف اقدامات اٹھائے۔ اینگلز نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ جو

لوگ سٹرائیک کرنے والوں میں تھے انہیں نوٹس دیدیئے گئے کہ وہ فیکٹری کے گھروں کو خالی کردیں، ایک ہفتہ کے اندر اندر 40 ہزار مزدوروں کے سامان کو گھروں سے باہر پھینک دیا گیا اور انہیں سڑکوں پر لا بٹھایا۔ اس سارے عمل کو اس بیدردی کے ساتھ کیا گیا کہ بوڑھے، بیمار اور حاملہ خواتین تک کا خیال نہیں کیا گیا اور انہیں بستروں سے نکال کر باہر کر دیا گیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امپیریل ازم سے فائدہ اٹھانے والے امراء اور حکمراں ہوتے ہیں، جو لوٹی ہوئی دولت سے عالیشان محلات بناتے ہیں، اور ایک ایسا کلچر پیدا کرتے ہیں کہ جس میں بظاہر نفاست اور شائستگی ہوتی ہے، ایسے ہی کلچر کی نشان دہی کرتے ہوئے 1899 میں لندن کی سیاحت کرنے والے جان بکانن (John Buchannan) نے کہا تھا کہ لندن کی اعلیٰ سوسائٹی میں گفتگو کرنا بھی ایک آرٹ ہو گیا ہے۔

برطانیہ جو کہ 19 صدی میں اپنے عروج پر تھا، اپنے ہی شہریوں کے ساتھ یہ ناروا سلوک کر رہا تھا، مگر دوسری جانب اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مہذب ہے اور دنیا کی غیر مہذب قوموں کو تہذیب کے دائرے میں لا رہا ہے۔ دیکھا جائے تو امپیریل ازم کے اندر درندگی اور وحشیانہ پن چھپا ہوتا ہے۔ اس کے استعمال کرتے ہوئے یہ مفتوح اور شکست خوردہ لوگوں پر ظلم واستبداد کرتے ہیں۔ لیکن جب ایک مرتبہ یہ کالونیز کے لوگوں کو غیر انسان بنا کر ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرتے ہیں، تو لازمی طور پر اس کا اثر ان کے معاشرہ پر بھی ہوتا ہے کہ جہاں حکمراں طبقے اپنے عوام کے ساتھ بھی بہیمانہ سلوک کرتے ہیں۔

اس کا اندازہ موجودہ امریکی امپیریل ازم سے بھی ہوتا ہے کہ جو ایک جانب یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ وہ لوگوں کو آمروں اور ڈکٹیٹروں سے نجات دلا رہے ہیں، مگر دوسری جانب وہ خود اپنے دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنے ہی لوگوں کے بنیادی حقوق کو پامال کر رہے ہیں۔ جمہوری اداروں اور روایات کو کمزور کر رہے ہیں، اپنے ہی لوگوں کی نگرانی کے لئے جاسوسی اداروں کو مضبوط کر رہے ہیں۔

امپیریل ازم انسانیت سے دور ہوتا ہے، یہ ایک ایسا قوی ہیکل اژدہا ہے کہ جو نہ صرف دوسروں کو نگلتا ہے، بلکہ اپنے لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتا ہے اور انہیں نہ ختم ہونے والی بھوک میں ہضم کر جاتا ہے۔

امپیریل ازم اور دروغ گوئی

تاریخ میں جب امپیریل طاقتیں دوسرے ملکوں پر حملہ کرتی ہیں، ان کی سرزمین پر قبضہ کرتی ہیں، اوران کے معدنی ذخائر اور دولت کو اپنے قابو میں لاتی ہیں، تو اس کے لئے ان کے پاس کچھ جواز ہونا چاہئے کہ جس کی مدد سے وہ اپنے عوام کو ذہنی طور پر اس حملہ کے جائز ہونے کے لئے تیار کریں۔ یہ اس لئے ضروری ہوتا ہے تاکہ انہیں عوامی مدد مل سکے، اس عوامی مدد میں فوجیوں کی بھرتی بھی ہوتی ہے کہ جو امپیریل ازم کے عظیم مقاصد کے حصول اور کامیابی کے لئے اپنی جان دینے پر تیار ہوتے ہیں، خاص طور سے جمہوری دور میں عوامی حمایت کی ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا اس حمایت کو حاصل کرنے کے لئے جھوٹ کی بنیاد پر اپنا مقدمہ تیار کیا جاتا ہے، پھر اس مقدمہ کو جھوٹے دلائل کے ذریعہ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کی مثال موجودہ دور میں امریکہ کا عراق پر حملہ ہے۔ اس حملہ کو صحیح اور درست ثابت کرنے کے لئے جھوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس جھوٹ میں امریکہ، برطانیہ اوران کے حلیف ملکوں کے سربراہین شامل تھے، جو ٹیلی وژن پر آ کر بے شرمی سے جھوٹ پر مبنی مقدمہ پیش کر رہے تھے۔

مثلاً یہ کہ عراق کے پاس مہلک ترین ہتھیاروں کا ذخیرہ ہے۔ اس کا پروپیگنڈا اس زور شور سے کیا گیا کہ امریکی اور یورپ کی اکثریت کو اس پر یقین ہوگیا۔ اس کے بعد جھوٹ کو مزید تقویت دینے کے لئے سی۔ آئی۔ اے اور دوسری خفیہ ایجنسیوں کی رپورٹس پیش کی گئیں، تاکہ یہ مقدمہ اور زیادہ مضبوط ہو جائے۔ یہاں تک کہ کولن پاؤل جو اس وقت سیکرٹری آف اسٹیٹ تھے، انہوں نے اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر یہ جھوٹا مقدمہ پیش کیا۔ اب جب کہ اس جھوٹ کا پردہ چاک ہو گیا، اور عراق کے پاس کوئی مہلک ہتھیار برآمد نہیں ہوئے، تو کولن پاؤل نے تسلیم کیا کہ انہوں نے جھوٹی رپورٹوں پر مبنی عراق کے خلاف دلائل دیئے تھے۔

عراق پر حملے کی دوسری دلیل یہ تھی کہ عراق کے پاس چونکہ مہلک ہتھیار ہیں، اس لئے وہ امریکہ کے لئے خطرہ ہے، یعنی عراق امریکہ پر حملہ کر کے تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ اس دلیل کو مسخرہ پن سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے، مگر اس خطرہ کو نہ صرف امریکہ بلکہ برطانیہ نے بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا، اور اس قدر جھوٹ بولا کہ عام لوگ واقعی یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ عراق ایک خطرہ ہو سکتا ہے۔

مگر حقیقت میں کیا ہوا؟ امریکہ، برطانیہ اور ان کے اتحادی عراق کے لئے خطرہ ہوئے، انہوں نے حملہ کر کے نہ صرف عراق پر قبضہ کیا، بلکہ تباہی اور بربادی کا جو سلسلہ شروع کیا، اس میں روزانہ اندازاً سو افراد مارے جاتے ہیں۔ عراقی معاشرہ تعلیم، صحت، امن و امان، اور تحفظ سے محروم ہو چکا ہے، وہاں امپیریل ازم نے فرقہ وارانہ فسادات کرا کے لوگوں کو خون میں نہلا دیا ہے۔ لیکن امپیریل طاقتوں اور اس کے حامیوں کو اس پر کوئی تاسف نہیں، کیونکہ ان کے عزائم، جن کو چھپایا جا رہا تھا، وہ بھی اب دنیا کے سامنے آ رہے ہیں۔ اب خود امریکی انتظامیہ کے افراد اس بات کو تسلیم کر رہے ہیں کہ عراق پر حملہ نہ تو اس کے مہلک ہتھیاروں کی وجہ سے کیا گیا تھا، اور نہ ہی عراق کسی بھی صورت میں امریکہ اور یورپ کے لئے خطرہ تھا، بلکہ اس کا اصل مقصد اس کے پٹرول کے ذرائع پر قبضہ کرنا تھا۔ اس کا دوسرا مقصد اسرائیل کو اس خطہ میں اور زیادہ طاقت ور بنانا ہے تاکہ وہ امریکی مفادات کا تحفظ کر سکے۔

لیکن جب امپیریل طاقتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جنگ و جدل اور خوں ریزی کو اختیار کرتی ہیں، تو وہ اپنے راستہ میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو دور کر دیتی ہیں۔ اگرچہ امریکی، برطانیہ اور یورپ میں جنگ کے خلاف لاکھوں لوگوں کے مظاہرے ہوئے، یہ ان لوگوں کے مظاہرے تھے کہ جو امپیریل طاقتوں کے جھوٹ اور ان کی دھوکا بازی سے واقف تھے۔ جمہوری معاشروں میں ان مظاہروں کا اثر ہونا چاہیئے، مگر آج کی صورت حال میں، امریکہ اور برطانیہ نے ان مظاہروں کی بھی پرواہ نہیں کی۔ ایک برطانوی سیاستداں نے کہا کہ فیصلے پارلیمنٹ میں ہوتے ہیں، سڑکوں اور شاہراہوں پر نہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ان جمہوری ملکوں میں بھی اب جمہوری روایات اور اقدار کی کوئی قدر نہیں رہی ہے، اور ان ملکوں

کے حکمراں طبقے دھاندلی، دھوکہ اور فریب سے اپنے مقاصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

چونکہ عراق پر حملے، اور اس میں مسلسل ہونے والی جنگ کو امریکہ، برطانیہ اور یورپ کے عوام نہیں روک سکے، ان میں سے اکثر امپیریل طاقتوں کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے، تو اکثر نے احتجاج کیا، مگر جنگ کو نہ روکا جاسکا اور نہ ختم کیا جاسکا۔

لہٰذا اب ایران پر حملہ کرنے کا منصوبہ ہے تو دروغ گوئی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ اب ایران کو ذمہ دار ٹھہرایا جارہا ہے کہ وہ عراق میں خانہ جنگی اور بدامنی کا ذمہ دار ہے، اب ایران کو ذمہ دار ٹھہرایا جارہا ہے کہ وہ افغانستان میں طالبان کو ہتھیار فراہم کررہا ہے، اب اسے الزام دیا جارہا ہے کہ اس نے لبنان میں حزب اللہ کو تیار کر کے وہاں خانہ جنگی کی فضا ہموار کی۔ ایران بھی اب عراق کی طرح امریکہ کے لئے خطرناک ہو گیا ہے کہ وہ اپنے میزائل اور ایٹمی تباہ کن ہتھیار بنا کر امریکہ پر حملہ کردے گا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا ستم ظریفی ہوگی کہ امریکہ عراق اور ایران سے خود کو خطرہ میں محسوس کرتا ہے، جب کہ اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ مہلک ترین ہتھیاروں کا ذخیرہ اس کے پاس ہے۔ اس نے سب سے پہلے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر ان دو شہروں کو تباہ کیا، اور اسی نے ویت نام پر قبضہ کر کے وہاں بربادی کی، اس کے فوجی اڈے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اور اسی کے عزائم ہیں کہ دنیا کے معدنی ذخائر پر قبضہ کر کے انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے۔ دیکھا جائے تو دنیا کو امریکی امپیریل ازم سے خطرہ ہے، نہ کہ امریکہ کو دنیا کے کسی ملک سے حملہ کا کوئی خطرہ ہے، اور یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ امریکی امپیریل ازم نہ صرف جارحانہ، ظالمانہ اور بربادی کو لانے والا ہوتا ہے، بلکہ یہ تمام جمہوری روایات اور اخلاقی قدروں کو پامال کر کے اپنا اقتدار قائم کرتا ہے۔

جب اس کا سامنا اپنے مخالفین سے ہوتا ہے تو اس کے سامنے نہ جنیوا کنونشن ہوتا ہے اور نہ ہی حقوق انسانی کے اصول، یہ بغیر مقدمے کے لوگوں کو جیلوں میں رکھتا ہے، اذیت اور تشدد کو جائز قرار دیتا ہے، اس کی خفیہ ایجنسیاں خفیہ طریقوں اور جھوٹ و فریب سے امپیریل مقاصد کو پورا کرتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فی الحال دنیا کے لئے اس سے نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

امریکہ اور آج کی دنیا

تاریخ میں یہ دستور رہا ہے کہ جب قومیں فوجی لحاظ سے طاقتور ہوتی ہیں ان کے پاس جدید اسلحہ آتا ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی کی مدد سے وہ اپنی قوت کو بڑھا لیتی ہیں تو اس کے نتیجہ میں ان میں یہ خواہش ابھرتی ہے کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کیا جائے، اور اپنی فوجی طاقت و قوت کی بنیاد پر دوسری قوموں کو عبور کیا جائے تاکہ وہ ان کی برتری اور عظمت کو تسلیم کریں۔ اس خواہش کے ساتھ ہی ان کا مقصد ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے ذرائع پر قبضہ کر کے انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور اگر دوسرا ملک ذرا بھی مقابلہ کرنے کی کوشش کرے تو اسے فوراً ہی کچل دیا جائے۔

اس ذہنیت کا اظہار اس وقت امریکی سامراجیت پوری طرح سے کر رہی ہے۔ اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر وہ دنیا میں اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتی ہے، اور دنیا کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اس کی شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے اقتدار کو چیلنج نہ کریں۔

امریکی سامراج کی اپنی اخلاقی قدریں اور اصول ہیں۔ مثلاً اسرائیل کے پاس نیوکلیئر ٹیکنالوجی اور بم موجود ہیں مگر اسے اس پر اعتراض نہیں کیونکہ امریکہ میں یہودی آبادی اس قدر بااثر ہے کہ کوئی امریکی سیاستدان ان کے خلاف نہیں بول سکتا ہے بلکہ اسے اس کی حمایت کا اعلان بار بار کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر دوسرا ملک نیوکلیئر ٹیکنالوجی کا حصول چاہتا ہے تو وہ ملک دنیا کے لئے خطرہ بن جاتا ہے۔ جیسے ایران کو آج کل عالمی خطرے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

عراق پر حملہ اس لئے کیا گیا کہ اس کے پاس دنیا کو تباہ کرنے والے مہلک ہتھیار تھے۔ جو درحقیقت نہیں تھے۔ مگر اس وقت سب سے زیادہ مہلک ہتھیار امریکہ کے پاس ہیں۔ اس قدر مہلک کہ وہ اس دنیا کو کئی بار بالکل تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ مگر اسے یہ مہلک

ہتھیار اس لئے عزیز ہیں کہ ان ہی کے سہارے اس کی لیڈری قائم ہے۔ مہلک ہتھیاروں کے ان ذخیروں کو جو برطانیہ، روس، اور فرانس میں ہیں کوئی ختم کرنے پر تیار نہیں ہے۔

امریکی اخلاقیات میں وہ تمام تحریکیں جو مقبوضہ ممالک میں مزاحمت کر رہی ہیں۔ وہ دہشت گرد قرار دے دی گئی ہیں۔ عراق، افغانستان اور فلسطین میں یہ مزاحمت امریکی اخلاقیات میں جرم ہے۔ اگر ایران مزاحمتی تحریکوں کی کوئی مدد کرتا ہے تو اسے غیر ملکی مداخلت کہا جاتا ہے۔ لیکن امریکہ کا عراق اور افغانستان پر قبضہ غیر ملکی مداخلت تصور نہیں کیا جاتا ہے۔

امریکہ اسرائیل کو اپنا سب سے بڑا اتحادی ملک قرار دیتا ہے۔ اس لئے اسرائیل کی جارحانہ پالیسیوں پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا ہے اس کا فلسطین پر قبضہ اور جولان کی پہاڑیوں پر قبضہ، ان سب کو نظر انداز کر کے اس کے ہر جارحانہ قدم کو اس کی سکیورٹی سے ملا دیا جاتا ہے۔ اگر فلسطینی تنظیم حماس اسرائیل کے خلاف مزاحمت کرتی ہے تو وہ دہشت گرد تنظیم ہو جاتی ہے۔ امریکہ میں الیکشن مہم میں اسرائیل دوستی کا مظاہرہ ہر صدارتی امیدوار کر رہا ہے۔ ہیلری کلنٹن نے اسرائیل کی محبت میں یہاں تک کہہ دیا کہ اگر وہ صدر ہوئیں اور ایران نے اسرائیل پر ایٹم بم پھینکا تو وہ ایران کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گی۔ بڑی عجیب بات یہ ہے کہ ابھی تک ایران کے پاس کوئی ایٹم بم نہیں ہے، جب کہ اس کا بڑا ذخیرہ اسرائیل کے پاس ہے۔ اور اب تک ہوا یہ ہے کہ کسی دوسرے ملک نے اسرائیل پر حملہ نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ اسرائیل جارح رہا ہے۔ اس نے عراق کی ایٹمی تنصیبات کو تباہ کیا تھا۔ حال ہی میں اس نے اس شبہ میں کہ شام شاید ایٹم بم بنا رہا ہے۔ اس کی تنصیبات پر حملہ کیا۔ چونکہ اسرائیل کو امریکی حمایت کا یقین ہے اس لئے وہ اپنے ہمسایہ ملکوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے برابر حملے کرتا رہتا ہے۔ فلسطین کے عوام کے لیے تو اس نے 1948 سے قتل عام کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔

لیکن امریکہ اور اسرائیل دونوں اپنی دہشت گردی، جنگجوانہ ذہنیت اور دنیا کے امن کو تباہ کرنے کے باوجود اخلاقیات کا پرچار کرتے ہیں۔ خود ان کے ملکوں میں اگر ان کی دہشت گردی کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو اسے دبا دیا جاتا ہے۔ دونوں ملک اپنے عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ ان کے لئے جنگ اور دہشت گردی اس لئے ضروری ہے کیونکہ وہ اپنے

عوام کا تحفظ چاہتے ہیں اور تحفظ کے اس نام پر دوسرے لوگوں کا قتل عام جائز سمجھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں طاقت ور ممالک اس طرح سے قتل و غارت گری اور خون ریزی کرتے رہیں گے کہ یا کبھی سوچ میں تبدیلی آئے گی۔ اور فوجی قوت و طاقت کا استعمال ختم ہو گا اور لوگوں میں بات چیت کے ذریعہ افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع ہو گا؟ فی الحال ایسی صورت نظر نہیں آتی ہے، اور شاید ماضی کی طرح حال میں بھی کمزور قومیں طاقتور کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہوتی رہیں گی، مگر غیر ملکی استحصال کے خلاف مزاحمت بھی جاری رہے گی، اور جانوں کی قربانیاں دے کر آزادی کا حصول بھی جاری رہے گا۔ یہ دونوں سلسلے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے۔

جنگ میں ہلاک ہونے والے

جرمن قوم ہر کام کو منظم طریقے کے ساتھ کرتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب انہوں نے کیمپوں میں جنگی قیدیوں، سیاسی مخالفوں اور یہودیوں کو رکھا تو ان کے بارے میں تمام معلومات رجسٹر میں درج کیں جس میں ان کے خاندان کی تاریخ کے ساتھ ساتھ جو چیزیں وہ کیمپ میں لائے تھے ان کا حساب کتاب بھی رکھا۔ ان میں سے جن قیدیوں کی کیمپ میں وفات ہوئی، ان کی بیماری کی تفصیل بھی ہے۔ حال ہی میں یہ تمام دستاویزات منظر عام پر آئی ہیں جن کی مدد سے مورخ ان کیمپوں کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

لیکن کیا دوسری یورپی اقوام نے بھی اس قسم کی دستاویزات رکھی ہیں، ایسا نہیں ہے۔ مثلاً امریکہ نے ویت نام کی جنگ کے دوران جو امریکی فوجی مارے گئے، ان سب کے نام واشنگٹن میں بطور یادگار ایک دیوار پر کندہ کرائے ہیں۔ مگر ویت نام میں جو لاکھوں شہری اور فوجی مارے گئے ان کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اس وقت بھی جنگ کے دوران مختلف گیسوں کے اثرات سے لوگ بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر رہے ہیں، ان کے بارے میں بھی خاموشی ہے۔

حال ہی میں جب عراق اور افغانستان میں امریکی یا یورپی فوجی مارے جاتے ہیں تو ان کی گنتی شروع ہو جاتی ہے مگر جب عراقی اور افغانی مارے جاتے ہیں تو اسے ''اجتماعی نقصان'' کہہ کر اس کی اہمیت کو گھٹا دیا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کا یک طرفہ پہلو ہے۔ لیکن یورپی کولونیل ازم کی تاریخ میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مثلاً 1857 کی جنگ آزادی میں جو انگریز مارے گئے، ان کے بارے میں نہ صرف کتابیں لکھی گئیں، بلکہ ان کی یادگاریں بھی تعمیر کی گئیں، مگر جو ہندوستانی مارے گئے، ان کے بارے میں خاموشی ہے کہ

جیسے یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔ حال ہی میں جب 1857 پر تحقیقات ہوئیں تو ہندوستان کے ایک مورخ امریش مسرا نے ان شواہد کی بنیاد پر جو کہ خود انگریزوں کی لکھی کتابوں، خطوط، ڈائریوں، اخبارات، اور سرکاری دستاویزات میں ہیں۔ اندازہ لگایا ہے کہ اس جنگ میں تقریباً 10 ملین ہندوستانی مارے گئے تھے۔ ان کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا، شوٹ کیا گیا تھا، اور توپ کے منہ سے باندھ کر اڑایا گیا تھا۔ لہٰذا مسرا اس واقعہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ہندوستان کا ''ہولوکاسٹ'' ہے۔ جس طرح ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں کو گیس چیمبرز میں مارا، اس سے زیادہ ظالمانہ طریقہ سے انگریزوں نے ہندوستانیوں کا قتل عام کیا اور پھر اس کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی کہ جیسے یہ واقعہ ہوا ہی نہیں۔

یہ ایک واقعہ نہیں ہے، پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ایک بڑی تعداد ہندوستانی فوجیوں کی تھی، جنہیں زمینداروں اور سرکاری عہدے داروں نے زبردستی فوج میں داخل کرایا تھا۔ یہ فوجی اپنے وطن سے دور یورپ اور افریقہ میں لڑے اور خندقوں میں لڑتے ہوئے جان دیدی۔ انگریزوں نے اپنے فوجیوں کے بارے میں تو معلومات اکٹھی کیں، اور فتح کے بعد محاذوں پر یادگاریں بھی تعمیر کرائیں، مگر ان میں ہندوستانی فوجی غائب ہیں، حال ہی میں یہ انکشاف ہوا کہ بلیجم میں ہندوستانی فوجی ہزاروں کی تعداد میں لڑتے ہوئے خندقوں میں مارے گئے تو ہندوستان کے کچھ صحافیوں نے مضامین لکھے۔ اور ان گمنام فوجیوں کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کی۔

آخر کیا وجہ ہے کہ یورپی کولونیل طاقتوں کا یہ رویہ ایشیا و افریقہ کے باشندوں کے ساتھ رہا ہے؟ اس کے پس منظر میں ان کا نسلی تعصب کہ وہ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، وہ برتر اور اعلیٰ ہے، دوسری نسلوں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب ہے، اس لئے اگر ان کا ایک فرد بھی مارا جائے تو یہ ان کے لئے نقصان کا باعث ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنے سماج کے لئے ایک سرمایہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں محکوم قومیں نہ صرف غیر مہذب، جاہل اور وحشی ہوتی ہیں، بلکہ ایک لحاظ سے اس دنیا پر بوجھ بھی ہوتی ہیں، اس لئے اگر اس کے افراد مارے جاتے ہیں تو اس سے دنیا کی تہذیب پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، دنیا اسی طرح سے ترقی کرتی ہے، آگے بڑھتی رہتی ہے۔

اس وجہ سے یہ اپنی قوم کے افراد کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ مقصد کے لئے جنگ کر رہے ہیں جب کہ ان کے سامنے لڑنے والے، یا ان کے ساتھ دینے والے محکوم قوموں کے لوگ بوجھ اٹھانے والے جانوروں کی طرح ہیں، اس لئے اگر یہ مارے جاتے ہیں، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

اپنے فوجیوں کو یہ اس لئے بھی عزت و احترام دیتے ہیں تا کہ دوسرے لوگ بھی فوج میں آئیں، اور یہ سمجھ کر آئیں کہ ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی حکومت و قوم ان کو یاد رکھے گی۔ اسی وجہ سے یہ اپنے مردہ فوجیوں کی ہڈیاں تک لاتے ہیں اور انہیں احترام کے ساتھ دفن کرتے ہیں۔ اس پالیسی کی وجہ سے تاریخ کا رخ کولونیل طاقتوں کی جانب مڑ جاتا ہے۔ وہ اس قابل ہوتی ہیں کہ اپنے نقطہء نظر سے تاریخ کو دیکھیں، اور جو انہیں پسند نہیں اسے نظر انداز کر کے تاریخ سے اسے نکال دیں۔

اب یہ ہمارے مورخوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ تاریخ کے ان گمنام گوشوں کو تلاش کر کے ان کی تاریخ مرتب کریں، تا کہ کولونیل حکومت کے جرائم ہمارے سامنے آئیں۔ یہودیوں نے جرمنوں کی ان ہی دستاویزات اور اپنی تحقیقات کے ذریعہ ''ہولوکاسٹ'' کا ایک تصور تشکیل دیا کہ جس میں لاکھوں یہودی مارے گئے۔ انہوں نے ان کے نام اور ان کے بارے میں تفصیلات جمع کیں، ان کی بنیاد پر انہوں نے اپنا مقدمہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ ان کے ساتھ کیا کیا مظالم ہوئے، اسی کو بنیاد بنا کر انہوں نے ہولوکاسٹ کے میوزیم یورپ اور امریکہ میں بنائے، تا کہ لوگوں کو اپنی حمایت کے لئے تیار کریں، اس میں وہ پوری طرح سے کامیاب ہیں، اور ہولوکاسٹ کا نعرہ لگا کر فلسطینیوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔

فاتح اور کتب خانے

تاریخ میں اکثر یہ ہوا ہے کہ جب بھی کسی فاتح قوم نے دوسروں کو شکست دی ہے، ان کی سرزمین پر قبضہ کیا ہے تو ان کی دولت اور مال و اسباب کو لوٹا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا ہے کہ انہوں نے خاص طور سے شکست خوردہ قوم کے علمی ذخیرے کو تباہ و برباد کیا ہے، تاکہ ان کو نہ صرف فوجی اور سیاسی شکست ہو، بلکہ ذہنی طور پر بھی انہیں علم سے محروم کر کے آگہی و شعور سے دور کر دیا جائے۔

مصر میں اسکندریہ کی لائبریری بڑی مشہور تھی، اس میں لاکھوں کی تعداد میں مختلف علوم و فنون پر کتابیں تھیں کہ جہاں اسکالرز، فلسفیانہ و ادبی مباحث میں مصروف رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی جہاز اس کی بندرگاہ پر آتا تھا تو پہلا سوال یہ کیا جاتا تھا کہ کیا وہ کوئی نئی کتاب کا مسودہ لائے ہیں۔ یہ قیمتی لائبریری رومیوں نے مصر کی فتح کے بعد جلا کر تباہ کر دی، اور وہ علمی ذخیرہ جو ماہرین کے ذہن کی پیداوار تھا، ایک لمحہ میں غائب ہو گیا۔

اس کی اور بھی مثالیں تاریخ میں ہیں، جب منگولوں نے وسط ایشیا، ایران اور افغانستان پر حملے کیے تو انہوں نے جہاں شہروں کو تباہ و برباد کیا، لوگوں کا قتل عام کیا، وہاں وسط ایشیا کے کتب خانوں کو آگ لگا کر علمی ذخیرہ کو ختم کر دیا۔ یہ وہ علمی کتابیں تھیں جو کئی صدیوں کی محنت کے بعد وجود میں آئیں تھیں۔ ان کے ضائع ہونے کی وجہ سے وسط ایشیا کا سماج ایک بار پھر پس ماندہ ہو گیا، اور اسے دوبارہ سے اپنی حیثیت کو بحال کرنے میں ایک طویل عرصہ لگا۔

جب ہلاکو خاں نے اسماعیلیوں کے قلعہ الموت پر حملہ کیا تو اس نے بھی حسن بن صباح اور اس کے جانشینوں کی جمع کی ہوئی نایاب کتابوں کو ضائع کر دیا۔ ''تاریخ جہاں

گشاہ'' کا مصنف جوینی اس وقت ہلاکو کے ساتھ تھا، اس نے لائبریری کی تباہی کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے خاص طور سے ہلاکو خاں سے سفارش کر کے چند نایاب کتابیں اپنے لئے لے لیں۔

جب یہی ہلاکو 1258 میں بغداد پر حملہ آور ہوا، تو عباسیوں کا جمع شدہ علمی سرمایہ بھی اس کے ہاتھوں تباہ ہوا، کتابوں کو یا تو جلا دیا گیا یا دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ اگر علمی سرمایہ کے اس نقصان کا اندازہ لگایا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے مسلمان سماج ذہنی طور پر بہت پیچھے ہو گیا۔ ان کی علمی و ذہنی ترقی رک گئی، ان کا رشتہ علم کے پچھلے ماخذوں سے ٹوٹ گیا۔ ان کی تحقیق کے راستے بند ہو گئے۔

فاتحین کا یہ رویہ قدیم دور یا عہد وسطیٰ ہی میں نہیں تھا، بلکہ جدید زمانے میں بھی ان کی یہی پالیسی رہی ہے، مثلاً 1857 میں جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کیا، تو جہاں انہوں نے لوٹ مار کی اور لوگوں کا قتل عام کیا، وہیں انہوں نے کتب خانوں کو تباہ و برباد کیا۔ خاص طور سے شاہی کتب خانہ کو جس میں بابر بادشاہ کے زمانے سے قیمتی مخطوطات کو جمع کیا گیا تھا، ان میں اکثر مخطوطات باتصاویر تھے۔ ان کتابوں کو نہ صرف لوٹا گیا بلکہ باتصاویر کتابوں کو پھاڑ کر ان کی تصاویر کو لے لیا گیا، اور باقی مسودہ کو پھینک دیا گیا جو کتابیں یہاں سے لوٹی گئیں، اب وہ یورپ کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ لیکن مغل شاہی لائبریریوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ شاہی کتب خانے کے علاوہ امراء اور اسکالرز کے کتب خانے تھے، جہاں قیمتی، اور نایاب کتابوں کو شوق سے جمع کیا گیا تھا۔ ان میں نواب ضیاء الدین کا کتب خانہ قابل ذکر ہے۔ مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں اس لائبریری کے بارے میں لکھا ہے کہ جس میں ان کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ لکھتے ہیں کہ

> ''غدر میں میرا گھر نہیں لٹا، مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا۔ بھائی ضیاء الدین خاں بہادر اور ناظر حسین مرزا ہندی و فارسی نظم اور نثر کے مسودات مجھ سے لے کر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ سو ان دونوں گھروں پر جھاڑو پھر گئی۔ نہ کتاب رہی نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں۔''

ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ میر ضیاء الدین خاں کے کتب خانے کی مالیت تقریباً اس وقت کے بیس ہزار روپیہ تھی۔ ''ایک ورق نہیں رہا'' سب لٹ گیا۔ ایک اور مشہور کتب خانہ مفتی صدرالدین آزردہ کا تھا، جسے لوٹ لیا گیا۔

یہی صورت حال اس وقت امریکی فاتحین کی ہے، جنہوں نے عراق پر قبضہ کے بعد بغداد کے کتب خانوں کو تباہ و برباد کر دیا، اور عثمانی عہد کی نایاب دستاویزات اس لوٹ مار میں بکھر گئیں۔

فاتحین کے اس عمل سے مفتوح قومیں اپنے علمی و ادبی ذخیرے سے محروم ہو جاتی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں ان کی ذہنی ترقی رک جاتی ہے اور جب انہیں دوبارہ سے علمی رشتوں کو استوار کرنا پڑتا ہے تو اس کے لئے اور زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی موجودہ فاتحین کا طریقہ یہ بھی ہے کہ اس علمی ذخیرے پر قبضہ کر کے اسے اپنے کتب خانوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ اس عمل کے نتیجہ میں علم پر ان کی اجارہ داری ہو جاتی ہے اور مفتوح قوم اپنی تاریخ اور شناخت کے لئے ان کی محتاج ہو جاتی ہے۔

معافی مانگنے کا سوال

کسی مہذب معاشرے میں غلطی پر معافی مانگنا، شائستگی کی علامت ہے۔ معافی مانگنے کی یہ روایت جاگیردارانہ سماج میں نہیں تھی، کیونکہ وہاں دولت اور طاقت کی بنیاد پر زبردست درجہ بندی تھی جس میں طبقہ اعلیٰ کے افراد کے لئے اپنے سے کم تر لوگوں سے معافی مانگنا توہین تھی۔ لیکن جمہوری روایات اور صنعتی کلچر نے جب اس درجہ بندی کو کمزور کیا تو اب کوئی بھی غلطی کرے تو اس کے لئے معافی مانگنا بے عزتی نہیں، بلکہ مہذب ہونے کی علامت ہے۔

اب معافی مانگنے کا یہ سلسلہ افراد سے لے کر قوموں تک آ گیا ہے۔ وہ قومیں جنہوں نے دوسرے ملکوں پر حملے کئے، لوگوں کا قتل عام کیا، ان کی دولت کو لوٹا، اور ان کے گاؤں اور شہروں کو جلایا و برباد کیا، اب ماضی کے ان جرائم سے بھی معافی مانگنے کا سلسلہ شروع ہے، مگر اس سلسلہ میں تمام اقوام شامل نہیں، یہ معافیاں وقت و حالات کو دیکھ کر مانگی جاتی ہیں، بعض اوقات ان کا مقصد سیاسی ہوتا ہے۔

تاریخ کئی لحاظ سے ایک متنوع مضمون ہے، یہ وقتاً فوقتاً ایسے متنازعہ موضوعات کو لوگوں کے سامنے لاتا ہے کہ جو یا تو بھلا دیئے گئے تھے، یا جن کی حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن جب ان موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی بہت سے نئے نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں، جو اس موضوع کو دوبارہ سے تاریخی اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ اب نئی تھیوریز اور نئے نظریات جو مختلف سماجی علوم میں ابھر رہے ہیں ان کی مدد سے ماضی کے واقعات کو بھرپور انداز سے سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً تاریخ میں ایک اہم مسئلہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کا ہے، اور اس کے ساتھ ہی مفتوحہ یا شکست خوردہ لوگوں کے قتل عام کا

ہے۔اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسپین کے سابق وزیراعظم ہوزے ماریا اذنار نے بیان دیا کہ آخر مغرب کے ممالک کیوں بار بار مسلمانوں سے ہر بات کی معافی مانگتے ہیں، جب کہ وہ کبھی بھی ہم سے معافی نہیں مانگتے ہیں۔اس کا کہنا تھا کہ:

''میں نے کبھی کسی مسلمان کو اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے نہیں دیکھا کہ انہوں نے اسپین پر قبضہ کرلیا تھا، اور یہاں وہ آٹھ صدیوں تک حکمراں رہے۔'' اس کی یہ بات صحیح ہے۔ مسلمانوں کو اس پر معافی مانگنی چاہئے کہ انہوں نے اسپین پر حملہ کیا، اس پر قبضہ کیا، اور وہاں آٹھ صدیوں تک رہے۔

لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس پر اور زیادہ بحث کریں، ضروری ہے کہ حملہ آوری اور قبضہ کے بارے میں سمجھا جائے، مثلاً جب ہم قبضہ کی بات کرتے ہیں تو اس کا کیا مطلب ہے، اور تاریخ میں اس کے کیا نتائج نکلے ہیں۔ مثلاً ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ تاریخ میں طاقت ور اقوام نے اپنی سلطنتوں کی وسعت کی خاطر کمزور ہمسایہ ملکوں پر حملے کئے، اور جب وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکے تو ان کے ملکوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنا اطاعت گذار بنالیا۔ ان مقبوضات کی صورت حال تاریخ میں مختلف رہی ہے۔ حملہ آور کبھی وقتی طور پر کسی علاقے پر قبضہ کر لیتے تھے، جب کہ ان کا اصل مقصد اس کی دولت اور ذرائع کو لوٹنا ہوتا تھا۔ لیکن کبھی وہ ان علاقوں پر اپنا مستقل قبضہ قائم کر لیتے تھے۔

جب کسی ملک اور علاقے پر مستقل قبضہ کیا جاتا تھا تو فتح مند قوم کے لئے اس قبضہ کو باقی رکھنے کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ یا تو آبادی کا قتل عام کر کے ان کی مزاحمت کا خاتمہ کر دے اور انہیں اپنا مطیع اور فرماں بردار بنالے، دوسری صورت یہ ہوتی تھی کہ فاتح، مقبوضہ لوگوں کے کلچر اور رسم و رواج کو اختیار کر کے وہاں کے باشندے ہو جاتے تھے، اور اس سرزمین کو اپنا لیتے تھے۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے، اگر عربوں کی فتح اسپین کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہو گا کہ انہوں نے فتح کے بعد یہاں مستقل قیام کا فیصلہ کیا، اور وہاں کے مقامی باشندوں سے میل جول کر کے ایک مشترک کلچر کو پروان چڑھایا۔ 1492 کا وہ اہم سال ہے کہ جب اسپین سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا، اور نئے فاتحین فرڈیننڈ اور ازبیلا نے مسلمانوں

اور یہودیوں کو اسپین سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اسی سال انہوں نے کولمبس کو سمندری مہم جوئی کے لئے تیار کیا کہ جس نے غلطی سے نئی دنیا کو دیافت کرلیا۔ امریکہ میں جانے کے بعد اہل اسپین نے وہاں کے مقامی باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا، یہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے، اس میں ان کی زمینوں پر قبضہ، ان کا بے دردی سے قتل عام، اور جنوبی امریکہ کی تین بڑی تہذیبوں کی تباہی شامل ہے۔

پیٹرک سیل (Patrick Sale) نے اپنی کتاب ''جنت کی فتح'' میں ان تمام مظالم کی تفصیل دی ہے جو کہ اہل اسپین اور بعد میں دوسری یورپی اقوام نے امریکی مقامی باشندوں کے ساتھ کئے تھے۔ اس میں مقامی باشندوں کا قتل عام ہی شامل نہیں بلکہ براعظم کے ماحول کی تباہی بھی شامل ہے۔

تاریخ ہسپانوی فاتحین کی لوٹ مار، لالچ، اور خوں ریزی کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ کورٹے (Cortes) (1485-1547) نے نہ صرف ایزٹک تہذیب کو تباہ برباد کیا بلکہ اس کے بادشاہ کو بھی سونے کی لالچ میں اذیت دے کر قتل کر دیا۔ کورٹے نے جس لوٹ کھسوٹ کی ابتداء کی تھی، اس کو دوسرے ہسپانوی فاتحین نے بھی اختیار کیا، سونے اور زمین کی لالچ میں مقامی باشندوں کو ان کی آبادیوں سے بے دخل کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا جنوبی امریکہ، برازیل کو چھوڑ کر، اسپین کی مقبوضات بنا لیا گیا۔ انہوں نے نہ صرف مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں سے محروم کیا، بلکہ انہیں مجبور کیا کہ وہ چاندی کی کانوں میں ان کے لئے کام کریں۔ اس کے ساتھ ہی انہیں عیسائی بنا کر انہیں پہاڑوں اور جنگلوں میں دھکیل دیا گیا کہ وہ اہل یورپ سے علیحدہ زندگی گذاریں۔

اسی طرح شمالی امریکہ کی کہانی بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اہل یورپ جو یہاں بطور مہاجرین کے آئے انہوں نے مقامی باشندوں کی زمینوں پر قبضہ کر کے ان کی آبادی کو مختلف حربوں اور طریقوں سے ختم کیا۔ اس وقت ان کی یہ حالت ہے کہ وہ غربت اور مفلسی میں مخصوص علاقوں میں رہتے ہیں۔ اسی عمل کو اہل یورپ نے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ میں دھرایا۔ جنوبی افریقہ میں انہوں نے خاص طور سے اپارتھائڈ کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے مقامی باشندوں کو ذلت وخواری کی حالت میں رکھا، مگر ان کی سستی

مزدوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اگر ان کی جانب سے اس استحصال کے خلاف مزاحمت ہوئی تو اسے سختی سے کچل دیا۔ موجودہ دور میں اس کی ایک مثال اسرائیل ہے، جو امریکہ اور یورپی طاقتوں کی حمایت سے خاص سیاسی مقاصد کے لئے بنایا گیا۔ اسرائیل نے اہل فلسطین کی سرزمین پر قبضہ کر کے ان کے مقامی باشندوں کو جو وہاں صدیوں سے رہ رہے تھے بے دخل کر دیا تا کہ ان کے گھروں دیہاتوں، اور شہروں پر قبضہ کیا جائے۔ اس بے دخلی کے لئے ان کا قتل عام بھی کیا، ان پر تشدد اور دہشت انگیزی کے حربوں کو بھی استعمال کیا، تا کہ وہ ڈر کر اور خوف زدہ ہو کر اپنی سرزمین چھوڑ دیں۔ 1967 کی جنگ کے بعد جولان کی پہاڑیوں اور مغربی کنارے پر قبضہ اب تک جاری ہے، اور یہ قبضہ بھی مستقل حیثیت اختیار کر رہا ہے۔ حال ہی میں امریکہ کا عراق پر حملہ اور قبضہ، اور افغانستان میں ان کی دخل اندازی تمام حقوق انسانی کی خلاف ورزی ہے۔

مقبوضات کے بعد دوسرا اہم مسئلہ لوگوں کے قتل عام کا ہے۔ مثلاً اس سلسلہ میں فرانس کی جانب سے ترکی سے کہا جا رہا ہے کہ 16-1915 میں ان کی حکومت نے جو آرمینی باشندوں کا قتل عام کیا تھا، اس پر وہ معافی مانگیں۔ فرانسیسی پارلیمنٹ نے اس سے متعلق ایک قانون نافذ کر دیا ہے کہ اگر کوئی اس واقعہ سے انکار کرے تو اس کو سزا دی جائے گی۔ اگر اس کو صحیح معنوں میں استعمال کیا جائے تو یہ درست اور جائز ہے۔ لوگوں کا قتل عام ایک وحشیانہ جرم ہے، اگر ریاستوں کو اس کی سزا نہیں ملتی ہے، تو کم از کم انہیں احساس جرم تو ہو، اور وہ اس کی معافی مانگیں۔ لیکن اب فرانس کو اپنی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے کہ اس نے کولونیل دور میں کتنے قتل عام کئے۔ اس کی ایک مثال تو الجزائر کی ہے۔ اور پھر دوسرے یورپی ملکوں کو بھی یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے اپنی مقبوضات میں کیسے لوگوں کا قتل عام کیا۔ برصغیر ہندوستان کی تاریخ میں جہاں اور بہت سے قتل عام ہوئے وہاں جلیانوالہ باغ کا قتل عام تو تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ جب ملکہ الزبتھ دوم کی ہندوستان آمد پر یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس واقعہ پر معافی مانگیں تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ اور پھر لیبیا کے لوگ کس طرح سے اطالوی فوجوں کے ہاتھوں قتل عام کو بھول سکتے ہیں، اور جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بموں کی تباہی آج بھی باعث عبرت ہے۔ فلسطین کے عوام

1948 سے اسرائیل کے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں، خاص طور سے دیریاسین میں عام لوگوں کا قتل عام مشہور ہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ باقی لوگ دہشت زدہ ہو کر ملک چھوڑ دیں۔

کولونیل تاریخ میں فاتح قوموں کے ہاتھوں عام لوگوں کا قتل عام ایک روایت رہی ہے، اس میں یونانی، رومی، عرب اور یورپی طاقتیں سب برابر کی شریک ہیں۔ المیہ یہ رہا ہے کہ جن افراد نے ان قتل عام میں حصہ لیا، انہیں ہیرو اور عظیم کا درجہ دیا گیا، اور ان کی تعریف میں گیت لکھے گئے، چاہے وہ ویت نام کا قاتل کرنل ہو جس نے ماضی میں لوگوں کو گولیوں سے بھون دیا تھا، یا ڈائر ہو جس نے جلیانوالہ باغ میں مجمع پر اس وقت تک فائرنگ کروائی جب تک کہ گولیاں ختم نہیں ہو گئیں۔

اس لئے تاریخ سے چند واقعات کو نکال کر، کچھ کو الزام دینا، اور بقایا کو معاف کرنا، صحیح نہیں ہے۔ اگر تاریخ سے سیکھنا ہے تو ان سب ملکوں کو معافی مانگنی چاہئے کہ جنہوں نے ماضی میں زبردستی ملکوں پر قبضے کئے، اور جو اب بھی اس رعونت کے ساتھ دوسرے ملکوں میں دخل اندازی کر کے، نہ صرف قبضے کر رہے ہیں، بلکہ لوگوں کو قتل بھی کرنے میں مصروف ہیں۔ اس کی موجودہ مثال امریکہ اور یورپ کے ملکوں کی ہے، جنہوں نے عراق اور افغانستان میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔

اگر صحیح تاریخی شعور پیدا کرنا ہے تو ہر امپیریل طاقت کو اعتراف جرم کرنا ہوگا، اگر وہ خود کو معصوم سمجھیں گے، اور دوسروں کو مورد عتاب قرار دیں گے، تو اس صورت میں ناجائز قبضہ اور قتل عام کا سلسلہ اسی طرح سے جاری رہے گا۔

قتل عام کا مسئلہ

پچھلے سال 2006ء میں فرانس کی پارلیمنٹ نے یہ قانون پاس کر دیا ہے کہ 1915ء میں یعنی پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانی حکومت نے آرمینیوں کا قتل عام کیا تھا، اگر کوئی اس سے انکار کرے گا تو یہ جرم ہوگا۔ حال ہی میں امریکی کانگرس میں آرمینیوں کے قتل عام کو پیش کیا جا رہا ہے تاکہ اس کی مذمت کی جائے اور اس سلسلہ میں قانون پاس کیا جائے، لوگوں کا قتل عام ایک جرم ہے، اگر کوئی قوم اس کی مرتکب ہوتی ہے تو اس پر تنقید کرنا، اور اس کو جرم قرار دینا ضروری ہے، مگر یہ نہیں ہونا چاہئے کہ کچھ قتل عام تو جرم ہوں، اور کچھ کو نظر انداز کر دیا جائے۔

ہٹلر نے یہودیوں کا جو قتل عام کیا، اسے وہ ''ہولو کاسٹ'' کا نام دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کئی ملکوں میں یہ قانون ہے کہ اگر اس سے انکار کیا گیا تو اسے جرم شمار کیا جائے گا اور اس کی سزا ہوگی۔ برطانیہ کے مورخ ارونگ (Irving) نے جب اس پر کتابیں لکھیں، اور ''ہولوکاسٹ'' کے واقعہ سے انکار کیا تو اسے آسٹریا میں قید کی سزا دی گئی۔

سوال یہ ہے کہ کیا دنیا میں صرف آرمینیوں اور یہودیوں کا قتل عام ہوا ہے کہ جن کے بارے میں قوانین پاس ہوئے ہیں، اور جن کی تشہیر زور شور سے ہو رہی ہے؟ کیا ان دو کے علاوہ اور کوئی قتل عام نہیں ہوئے؟ یا اگر ہوئے ہیں تو ان کے بارے میں خاموشی کیوں ہے؟ دنیا کی تاریخ میں فاتح اقوام ہمیشہ مفتوح قوموں کا قتل عام کرتی رہی ہیں، چاہے وہ یونانی ہوں، یا رومی، بازنطینی، یا عرب، لیکن موجودہ زمانے میں جیسے جیسے دنیا کے لوگوں میں شعور آیا، تو ان میں عوام کے قتل عام کے خلاف جذبات ابھرے، لیکن طاقت ور اقوام کہ جن کے پاس ذرائع ابلاغ ہیں، وہ اپنے جرائم کو چھپا لیتے ہیں، اور دوسروں کے جرائم کو خوب

اجاگر کرتے ہیں۔ اگرچہ اب ان جرائم کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، مگر ان کے بارے میں ذکر نہیں کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب یورپی اقوام، امریکہ، آسٹریلیا، اور نیوزی لینڈ گئیں تو انہوں نے ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے کی غرض سے مقامی باشندوں کا باقاعدہ قتل عام کیا، یہاں تک کہ ان کی آبادی کو اس قدر گھٹا دیا کہ وہ ان کے لئے خطرے کا باعث نہیں رہے۔ جنوبی افریقہ میں؟ باشندوں کا قتل عام موجودہ دور تک رہا۔

اس کے بعد افریقہ سے غلاموں کی تجارت اور انہیں امریکہ اور جزائر غرب الہند لے جا کر محنت و مشقت کرانا، بھی تاریخ کا حصہ ہے، جب بھی ان غلاموں نے آزادی کی جدوجہد کے لئے بغاوت کی تو اسے بے رحمی سے کچل دیا گیا، اس قتل عام پر کسی کو تاسف نہیں ہے۔

کولونیل دور میں یورپی اقوام نے اپنے مقبوضات میں جو قتل عام کئے، وہ تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں، اٹلی نے لیبیا میں، فرانس نے الجزائر میں، اور برطانیہ نے ہندوستان میں۔ ہمارے پاس 1857ء کے قتل عام کی تفصیلات موجود ہیں کہ جس میں تقریباً ایک اندازے کے مطابق 10 لاکھ لوگوں کو مارا گیا۔ جلیانوالہ باغ کا قتل عام ہماری تاریخ میں موجود ہے۔ مگر کیا ان پر کولونیل ملکوں کو کوئی افسوس ہے؟

ہٹلر نے صرف یہودیوں کا ہی قتل عام نہیں کیا تھا، بلکہ ان میں کمیونسٹ بھی تھے، اور خانہ بدوش قبائل بھی تھے، چونکہ ان کے پاس ہونے والے مظالم کو بیان کرنے کے ذرائع نہیں، اس لئے دنیا کو صرف یہودیوں کا قتل عام یاد رہ گیا۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ یہودی کہ جن کا قتل عام روس، برطانیہ، اسپین، اور جرمنی میں ہوتا رہا، انہیں اپنے بارے میں ہونے والے مظالم تو یاد ہیں، مگر اسرائیل کے قیام کے بعد وہ مسلسل فلسطینیوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ 1948ء میں دیرہ یاسین میں پورے گاؤں کے لوگوں کو معہ عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تاکہ فلسطینی دہشت زدہ ہو کر ملک چھوڑ دیں۔ اس کے بعد سے اسرائیل کے ہاتھوں یہ سلسلہ جاری ہے، 1982ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا تو وہاں اس کے اشاروں پر صابرہ اور شتیلا کے فلسطینی کیمپوں میں عورتوں اور بچوں کا قتل عام ہوا۔ جن کی تصاویر پوری دنیا نے دیکھیں اور اس جرم سے آنکھیں بند کر لیں۔

بوسنیا میں جو سربوں نے قتل عام کیا، وہ کوئی چھپا ہوا نہیں تھا، اس کے بارے میں سب کو آگہی تھی، مگر یہ سلسلہ جاری رہا، اور اب امریکی فوجیں عراق اور افغانستان میں لوگوں کا قتل عام کر رہی ہیں، اس پر ساری دنیا خاموش ہے۔ ان مثالوں کے علاوہ اور بہت سی مثالیں تاریخ میں ہیں، امریکی فوجوں کا ویت نام میں قتل عام، دوسری جنگ کے دوران جاپانیوں کا نانکنگ میں چینیوں کا قتل عام، وغیرہ۔

سوال یہ ہے کہ اگر آرمینیوں اور یہودیوں کا قتل عام جرم تھا، تو یہ جرم ہر اس قوم نے کیا ہے کہ جو لوگوں کے قتل عام میں ملوث ہوئی ہے۔ اس لئے نظریاتی طور پر اس اصول کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ "قتل عام" چاہے جو کرے وہ جرم ہے، ماضی میں ہونے والے قتل عام کی سزا تو اب نہیں دی جا سکتی، مگر جن اقوام نے یہ کیا تھا، انہیں اس جرم کو مان کر معافی مانگ لینی چاہئے، اور مستقبل میں اسے جرم قرار دے کر جو اس کے مرتکب ہوں انہیں سزا ملنی چاہئے۔ چاہے وہ امریکہ ہو، روس ہو، یا اور کوئی بڑی طاقت، اگر قتل عام کے مفہوم کو محدود کر کے دیکھا گیا تو اس صورت میں طاقت ور اقوام اسے جاری رکھیں گی، اور لوگوں کا قتل عام ہوتا رہے گا۔

اقتدار کا نشہ

محمد بن تغلق (1325-1351) سلاطین دہلی میں ایک ایسا حکمراں تھا کہ جس میں جدت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اور جن کے وہ تجربات بھی کرتا رہتا تھا۔ لیکن اپنی طبیعت اور سختیوں کی وجہ سے وہ بہت جلد رعایا میں غیر مقبول ہو گیا اور جگہ جگہ اس کے خلاف بغاوتیں بھڑک اٹھیں۔ جب وہ ان بغاوتوں کو دبانے اور کچلنے میں ناکام ہو گیا تو ایک دن اس نے دربار کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کو بلایا، جنہوں نے ''تاریخ فیروز شاہی'' نام کی کتاب لکھی ہے اور ان سے پوچھا کہ ایک مورخ کی حیثیت سے وہ اسے مشورہ دے کہ ماضی میں جب حکمراں اس صورت حال سے دوچار ہوتے تھے تو ان کا کیا رویہ ہوتا تھا اور وہ کس طرح سے حالات پر قابو پاتے تھے۔ ضیاء الدین برنی نے اس پر کہا کہ اس قسم کے حالات میں حکمرانوں کا دو طرح کا رویہ ہوتا تھا، یا تو وہ تخت و تاج سے دستبردار ہو جاتے تھے اور حکومت و اقتدار اپنے وارث یا جانشین کے حوالہ کر دیتے تھے، یا وہ حکومت کے اختیارات اپنے وزراء کے حوالے کر دیتے تھے اور خود عیش و عشرت میں ڈوب کر تمام مسائل کو بھلانے کی کوشش کرتے تھے۔

محمد بن تغلق نے اس مشورہ کو ماننے سے انکار کر دیا، کیونکہ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ حکومت کے اختیارات کسی اور کو سونپے اور اپنی زندگی میں اقتدار سے محروم ہو کر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرے۔ اس کے نزدیک اس کے اس عمل سے اس کے مخالفوں اور دشمنوں کو خوشی ہو گی، اور اس کے لئے یہ شکست کا باعث ہو گا۔ لیکن مسلسل بھاگ دوڑ اور ذہنی دباؤ نے اسے اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ اس کے بعد جلد ہی مر گیا۔ برنی نے اس کی وفات پر جو تبصرہ کیا وہ قابل غور ہے، اس نے لکھا کہ: ''سلطان کو لوگوں سے نجات مل گئی، اور لوگوں کو سلطان سے۔''

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں یہ شہادت ملتی ہے کہ جب بھی طاقت اور اختیارات ایک فرد کے ہاتھوں میں آجائیں تو اس کے نتیجہ میں اس کی شخصیت بدل جاتی ہے اور وہ خود کو دوسروں سے افضل و اعلیٰ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے اردگرد مصاحبین بھی اسے ارفع و برتر بنا دیتے ہیں، اور اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ ان صفات کا مالک ہے کہ جو عام لوگوں میں نہیں ہیں، اس کی شخصیت میں دلکشی اور جادو ہے، اس لئے اسے دوسرے لوگوں پر فوقیت ہے۔ جب اس کو اپنی ذات پر اس قدر یقین ہو جائے تو پھر وہ یہ گوارا نہیں کرتا ہے کہ اس کے اختیارات کے بارے میں کوئی سوال کرے، ان کی مخالفت کرے، یا اس پر تنقید کرے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ وہ قوم کے لئے ایک مسیحا کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے بطور نجات دہندہ ہونے کے لوگوں کو چاہیئے کہ اس کی اطاعت و فرماں برداری کریں، اس کے خلاف بولنے والا باغی اور غدار گردانا جاتا ہے۔

عام طور سے ہر آمر یا ڈکٹیٹر کا ایک ویژن ہوتا ہے کہ جس کے تحت وہ قوم و ملک کی تشکیل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً نپولین کی خواہش تھی کہ فرانس کو ایک عظیم سلطنت میں تبدیل کر دے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس خواہش کی تکمیل وہ فتوحات اور جنگوں کے ذریعہ کر سکتا ہے۔ اس لئے اس نے یورپ کو فتح کرنے کی مہمات شروع کر دیں تھیں۔ ہٹلر چاہتا تھا کہ جرمن نسل کی برتری کو دنیا کی دوسری اقوام پر مسلط کر دے۔ مسولینی کے عزائم تھے کہ اٹلی کو دوبارہ سے رومی سلطنت کی شان و شوکت دیدے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایسے آمر بھی ہوتے ہیں کہ جو سماج کو کسی نظریہ کی بنیاد پر تعمیر کرنا چاہتے ہیں، اور اس عمل میں وہ پابندیوں اور سختیوں پر عمل کرتے ہیں۔ آمروں کی ایک وہ قسم بھی ہوتی ہے کہ جو اپنے اقتدار اور اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ملک و قوم کی دولت لوٹتے ہیں۔ اس لوٹ میں وہ اپنے خاندان کے افراد اور خوشامدی مصاحبین کو بھی حصہ دیتے ہیں۔ جب ان کے خلاف عوامی بغاوتیں اٹھتی ہیں تو یہ لوگ معہ دولت کے غیر ملکوں میں پناہ لے لیتے ہیں۔

جب بھی کوئی ایک فرد حکومت کے تمام اختیارات کو سمیٹ کر اپنی ذات میں جمع کر لیتا ہے تو اس کا رد عمل یہ ہوتا ہے کہ ریاست کے دوسرے اداروں کو کمزور کیا جائے، اور

انہیں اپنے تسلط میں رکھا جائے۔ تاکہ اس کی ذات کو کوئی چیلنج نہیں کر سکے۔ وہ ان ریاستی اداروں کو اپنے ذاتی مقاصد اور مفادات کے لئے استعمال کرتا ہے، لہٰذا نوکر شاہی ہو، فوج، یا پولیس ہو، خفیہ ایجنسیاں ہوں، یا عدالتیں ہوں، یہ سب اس کے اشاروں پر عمل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو کچلتے ہیں کہ جو آمر کے اختیارات پر تنقید کرتا ہے، یا اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ ان اداروں کے لئے قانون سے بالاتر ہو کر حکومت مخالفوں کو اغوا کرنا، قید میں ڈالنا، اذیت دینا، اور قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ مخالفوں کو دبانے اور کچلنے کے لئے تشدد اور ریاستی دہشت گردی سب سے زیادہ موثر ہتھیار ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ہٹلر نے کہا تھا کہ "لوگ ہماری مخالفت کرنے کے بارے میں دو بار سوچنے پر مجبور ہوں گے، اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ قیدیوں کے کیمپ میں ان کے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔"

آمرانہ حکومت میں ایک اہم اصول یہ ہوتا ہے کہ معلومات کے تمام ذرائع پر اس کا کنٹرول ہو، تاکہ لوگوں کو معلوم ہی نہ ہو کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ ملک اور عالمی خبروں کے لئے صرف ریاستی ذرائع ہوتے ہیں کہ جو پسند کی خبروں کو نشر کرتے ہیں۔

دیکھا جائے تو جدید آمروں کے لئے نپولین نے حکومت کا ایک ماڈل پیش کیا ہے کہ کس طرح لوگوں پر حکومت کی جائے، اور ان کے ذہنوں پر کس طرح تسلط کو برقرار رکھا جائے۔ جیسے ہی نپولین اقتدار میں آیا، اس نے اخبارات کی اہمیت کو محسوس کر لیا، اور فرانسیسی اخبارات کو ریاست کے کنٹرول میں دے کر اس پالیسی کو اختیار کیا کہ ان میں اس کی فتوحات کی خبریں شائع ہوں، اور اس کی شکستوں کے بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی جائے۔ اس لئے جب فرانسیسیوں کو ٹرافلگر کی شکست ہوئی تو یہ خبر کسی فرانسیسی اخبار میں نہیں چھپی اور فرانس کے لوگ اس سے بے خبر رہے۔ اس نے اس پر ہی بس نہیں کیا بلکہ سنسر شپ کو موثر بناتے ہوئے، ان تمام اخباروں اور رسالوں کو بند کر دیا کہ جنہوں نے ریاستی احکامات پر عمل نہیں کیا۔ ناشرین کو یہ حلف لینا پڑتا تھا کہ وہ نپولین کے خلاف کوئی چیز نہیں چھاپیں گے۔ اس نے خفیہ ایجنسیوں کو یہ اختیارات دیدیئے تھے کہ وہ اس کے مخالفوں کو اغوا کر کے بغیر کسی مقدمے کے جیل میں رکھ سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دور حکومت میں پولیس اس کے مخالفوں کے گھروں میں گھس کر سامان کی تلاشی لیتی تھی،

اوران کے ساتھ نازیبا سلوک کرتی تھی۔

اپنی حکومت کو قانونی جواز دینے کے لئے وہ وقتاً فوقتاً ریفرنڈم بھی کراتا تھا، کہ جس میں اکثریت اس کے حق میں ووٹ دیتی تھی۔اس کے علاوہ لوگوں کی ہمدردیاں اور حمایت حاصل کرنے کے لئے اس نے قوم پرستی کے جذبات کو پوری طرح سے ابھارا۔ اگرچہ وہ مذہبی نہیں تھا، مگر عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس نے مذہب کو بھی اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔

نپولین کے اس ماڈل کواور زیادہ موثر شکل میں ہٹلر اور مسولینی نے استعمال کیا۔ ہٹلر کے زمانے میں جرمنی اور اس کی ریاست کے تمام ادارے مکمل طور پر اس کے تابع تھے۔اپنے اختیارات کو نافذ کرنے اور عوام میں خوف وہراس پیدا کرنے کے لئے اس نے ایس ایس (SS) نام سے فوجی ادارہ بنایا، لوگوں کے خیالات معلوم کرنے کے لئے خفیہ ادارے تھے، جومخالفوں کو گھروں سے اٹھالاتے تھے، انہیں تشدد کا نشانہ بناتے تھے، اور بعض حالات میں ان کو قتل بھی کردیتے تھے۔

نازی حکومت کے ابتداء میں جج، حکومت کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے، اس پر گورنگ، جو ایک اہم نازی لیڈر تھا، اس نے ججوں کو دھمکاتے ہوئے کہا ''انتظار کرو کہ ہم تمہیں عدالتوں سے باہر کریں'' اس پر ہٹلر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا: ''میرے عزیز گورنگ، یہ صرف تھوڑے عرصہ کی بات ہے اس وقت تک صبر کرو۔''

ہٹلر نے اپنے اس وعدے کو پورا کیا اور 1933 میں سول سروس لاء پاس کیا کہ جس کے تحت ان تمام ججوں کو ملازمت سے فارغ کردیا گیا کہ جو حکومت کے حق میں نہیں تھے۔اس کے بعد سے عدلیہ نازی حکومت کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار تھا کہ جس کے ذریعہ وہ اپنے مخالفوں کو سزائیں دلواتے تھے۔

ایشیا، افریقہ، اور لاطینی امریکہ میں ڈکٹیٹرز اس ماڈل کو بڑے ظالمانہ انداز میں اختیار کرتے ہیں مثلاً مارکوس، عیدی امین، پنوشے، اور سہارتو ایسے ڈکٹیٹر تھے کہ جنہوں نے عوام کی دولت کو لوٹا، اور بڑی بے شرمی کے ساتھ لوگوں کی غربت و مفلسی کے درمیان شاہانہ طور پر زندگی گذارتے رہے۔ان لوگوں نے نہ صرف عام لوگوں کی زندگی اجیرن کردی، بلکہ

پابندیوں اور سختیوں کے سبب اپنے ملکوں کی ذہنی ترقی کو بھی روک دیا۔ ان کی پالیسیوں کی وجہ سے ملک کی معیشت تباہ ہوئی، اور سیاسی طور پر ملک انتشار کا شکار ہوئے۔

یہ لوگ بطور ڈکٹیٹر شاید بغیر کسی احساس اور اعتراف جرم کے زندہ رہتے ہوں، اور خاموشی سے مر بھی جاتے ہوں، مگر تاریخ انہیں معاف نہیں کرتی ہے، بلکہ ان کے جرائم کو محفوظ کر کے، انہیں ان مجرموں میں شامل کرتی ہے کہ جنہوں نے انسانیت کو نقصان پہنچایا۔ وقت گذر جاتا ہے، عام لوگ ان کے مظالم اور جرائم کی اذیت کو یادوں سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تاریخی دستاویزات ان کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لیتی ہیں۔

پاکستان میں عوامی مظاہرے

پاکستان میں آزادی کے بعد، ریاست نے عوامی مظاہروں اور احتجاجوں کے خلاف کولونیل پالیسی کو جاری رکھا اور اس مقصد کے لئے پولیس کو استعمال کیا تا کہ حکومت یا ریاست کے خلاف جو بھی عوامی اقدامات ہوں انہیں سختی کے ساتھ کچل دیا جائے۔ پولیس بھی چونکہ کولونیل دور کی تربیت یافتہ تھی، اور اس کا ذہن بھی عوام کے خلاف تھا، لہٰذا اس نے بھی اسی ظالمانہ اور سختی پر عمل کرتے ہوئے جب بھی موقع ملا، لوگوں کے ایجی ٹیشن اور احتجاج کو ختم کر دیا۔ لاٹھی چارج کے طریقہ کار کو جاری رکھا گیا، آنسو گیس کا استعمال بھی اسی طرح سے ہوتا رہا۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا آزادی کے بعد نئی ریاست کے حکمراں عوام میں سے نہیں تھے؟ یا ان کے مفادات اور عوام کے مفادات میں فرق تھا؟ کیونکہ کولونیل دور میں تو کہا جا سکتا تھا کہ غیر ملکی حکمرانوں کا تعلق عوام سے نہیں تھا، اس لئے ان کے دلوں میں کوئی ہمدردی کے جذبات نہیں تھے، وہ سختی کے ساتھ اپنے خلاف ہر احتجاج کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پاکستان کی ریاست پر اب جو لوگ قابض تھے وہ غیر نہیں تھے، اس لئے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ عوام کے حقوق کا پاس کریں گے اور ان کا دفاع کریں گے۔ مگر اس کے بجائے ان کا رویہ عوام کے خلاف آخر کیوں مخالفانہ ہوا؟

اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان میں جب آمرانہ اور غیر جمہوری حکومتوں کا قیام عمل میں آیا، تو ان کے اور لوگوں کے درمیان فاصلے بڑھ گئے۔ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے یہ ہر مقبول عام تحریک کو کچلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ حکمراں طبقوں اور عوام دونوں میں ایک دوسرے کے خلاف بداعتمادی کی فضا پیدا ہوگئی۔ ایسی صورت میں پولیس، خفیہ ادارے، اور

فوج، ان سب کو عوامی مظاہروں کو دبانے اور کچلنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ایک طرف تو اقتدار کے خواہش مند سیاستدانوں نے عوام کی طاقت کو اپنی حمایت میں استعمال کیا، مگر جب وہ اقتدار پر قابض ہو گئے تو یہی عوامی مجمع ان کے لئے خطرناک ہو گیا۔ مثلاً ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کو ایوب خاں کے خلاف ابھارا، اور اقتدار حاصل کیا، مگر جب حکومت کے اختیارات آئے تو اعلان کیا کہ "ریاست کی طاقت، اسٹریٹ پاور" سے زیادہ طاقتور اور موثر ہے۔

ملک کی سیاسی صورت حال کے تحت، ہم ساٹھ سال سے ریاست اور لوگوں کے درمیان تصادم اور کش مکش کو دیکھ رہے ہیں۔ بڑے شہروں میں، جیسے کراچی، لاہور، حیدر آباد، ملتان، اور راولپنڈی کے کہ جہاں آبادی بہت گنجان ہے اور گلیاں تنگ ہیں، وہاں جب پولیس اور مظاہرین کے درمیان مقابلہ ہوتا ہے تو پولیس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ تنگ گلی کوچوں میں لوگوں کے پیچھے بھاگیں اور ان پر لاٹھیاں برسائیں۔ مثلاً کراچی میں لیاقت آباد، اپنی تنگ گلیوں اور بھول بھلیوں کی وجہ سے مشہور ہے کہ پولیس یہاں پر مظاہرین کے تعاقب میں جانے سے کتراتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں پولیس کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ چوڑی و کشادہ شاہراہوں پر لوگوں سے مقابلہ کرے جیسے لاہور میں مال روڈ اور ایم۔اے۔ جناح روڈ کراچی میں یہاں پولیس آسانی کے ساتھ مظاہرین سے نمٹ سکتی ہے۔ اسلام آباد دوسرے شہروں سے مختلف ہے، کیونکہ یہاں سڑکیں کھلی اور سیدھی ہیں، اس کے دونوں جانب گلی کوچے نہیں ہیں، اس لئے ہم نے دیکھا کہ جب یہاں مظاہرے ہوئے تو لوگوں کو پولیس کے مقابلہ میں بھاگنے اور چھپنے کے مواقع نہیں تھے، اس لئے پولیس نے موثر انداز میں ان کا مقابلہ کیا اور لوگوں کو بڑی تعداد میں گرفتار کیا۔

دیکھا گیا ہے کہ حکمراں طبقے، لوگوں کی طاقت اور ان کے مخالفانہ جذبات کا صحیح اندازہ نہیں لگاتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں طاقت و قوت کے ذریعہ کچلا جا سکتا اور خاموش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے جمہوری روایتیں زور پکڑ رہی ہیں، اسی طرح سے اسٹریٹ پاور زیادہ ابھر کر آ رہی ہے، اور وہ اس قابل ہو رہی ہے کہ غیر جمہوری اور آمرانہ

حکومتوں کو الٹ دیں، اس کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، جب جارجیا اور یوکرین میں اور روس کے زوال کے بعد اس کی بہت سی آزاد ہونے والی ریاستوں میں، عوام کے مظاہروں اور احتجاجوں نے حکومتوں کو بدل کر رکھ دیا۔

لیکن آمر، تاریخ سے کبھی سبق نہیں سیکھتے ہیں، ان کو ریاست کی اتھارٹی اور اپنے سیاسی اختیارات پر اس قدر اعتماد اور یقین ہوتا ہے کہ وہ عوامی طاقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اور اقتدار سے اس وقت تک چمٹے رہتے ہیں کہ جب تک زبردستی انہیں اس سے علیحدہ نہیں کر دیا جائے۔

افسوس کا مقام ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں لوگ سیاسی حقوق اور قانون کی بالادستی کے لئے سڑکوں پر نکل آئے، پولیس کی لاٹھیں کھائیں، زخمی ہوئے، قید و بند کی اذیت سے گذرے، اور مارے بھی گئے، مگر نتیجہ اب تک ان کے حق میں نہیں نکلا، ان کی قربانیوں کے نتیجہ میں بدعنوان سیاستدان، ان کے نام پر حکومت پر قابض ہوئے، اور عوام دشمنی کی پالیسیوں کو جاری رکھا۔ ایوب خان، یحییٰ خان، بھٹو اور ضیاء کے خلاف لوگوں نے جو احتجاج کیا اس کا فائدہ حکمراں طبقوں نے اٹھایا، عوام اسی طرح سے سڑکوں پر بے یار و مددگار رہے۔

اس کے مقابلہ میں وہ ملک کے جہاں جمہوریت ہے، وہاں عوام کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ سڑکوں پر آئیں اور اپنے مطالبات کے لئے مظاہرے کریں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں ہوتا ہے کہ حکومتیں لوگوں کے احتجاج اور مظاہروں کی وجہ سے اپنی پالیسیاں تبدیل کر دیں۔ لیکن لوگوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کریں، اکثریت کی رائے کو اپنے حق میں استوار کریں، جب الیکشن کا وقت آئے تو وہ اپنے ووٹوں کے ذریعہ اپنی پسندیدہ حکومت کو منتخب کر سکیں۔

قومی مفاد کے نام پر

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بارے میں ایک بحث کے دوران یہ دلیل دی گئی کہ اس وقت لیا گیا فوجی ایکشن قومی مفاد پر مبنی تھا، اور فوج نے جو اقدامات لئے ان کی بنیاد حب الوطنی پر تھی کیونکہ اس کا مقصد ملک کی سلامتی تھا اور وہ علیحدگی کی تحریک کو روکنا چاہتی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ بڑی خطرناک دلیل ہے جو کہ حکمراں طبقوں کی حمایت میں دی جا سکتی ہے۔ اس دلیل کے تحت ریاست پر قابض طبقوں کے وہ تمام اقدامات درست اور جائز ہو جاتے ہیں جو وہ قومی مفاد کے نام پر اٹھائے جاتے ہیں۔ ان میں لوگوں کا قتل عام، تشدد، سیاسی مخالفوں کی قید و بند یہ سب قانون کے تحت صحیح ہو جاتا ہے۔

اگر اس دلیل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ان ساٹھ سالوں میں حکمراں طبقوں کی جانب سے جو مظالم ہوئے ہیں سیاسی مخالفوں کو جو اذیتیں دی گئی ہیں۔ جیلوں میں رکھا گیا ہے ان میں خوف و ہراس پیدا کیا گیا ہے۔ اس پر نہ تو تنقید کی جا سکتی ہے اور نہ اسے چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ یہ چاہے وہ مشرقی پاکستان کا سانحہ ہو، بلوچستان، سندھ اور سرحد میں لئے گئے فوجی اقدامات ہوں یہ سب قومی مفاد کے نام پر جائز ہو جاتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے ''خود قوم کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنے قومی مفادات کے حق میں آواز اٹھائے۔'' یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ آخر وہ کون سا اخلاقی جواز ہوتا ہے کہ جس کا سہارا لیتے ہوئے بغیر کسی احساس کے لوگوں کو دبایا جاتا ہے۔ کچلا جاتا ہے اور ان کی عزت و ناموس کے پرخچے اڑائے جاتے ہیں۔

قومی ریاست کا تصور سب سے پہلے فرانس میں انقلاب 1789 کے دوران ابھرا۔ اس کی تقلید میں آزادی کے بعد ایشیا و افریقہ کے ملکوں نے بھی قومی سیاست کے

ادارے کو اپنا لیا۔ اس نے حکمراں طبقوں کو یہ مواقع فراہم کئے کہ قومی ریاست پر قابض ہونے کے ساتھ ہی وہ قومی مفادات پر بھی اپنی اجارہ داری قائم کرلیں اور افراد جو ریاست سے باہر ہیں۔ انہیں قومی مفادات کے استعمال سے محروم کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم اور اس کے مفادات کے نام پر حکمراں طبقوں نے اپنے اختیارات کو بڑھایا اور اپنے استحکام کے لئے انہیں استعمال کیا۔

ایک مرتبہ جب ریاستی اداروں پر حکمراں طبقوں کا قبضہ ہو گیا۔ ان کی مدد سے انہوں نے اختیارات کی مدد سے اپنی مراعات کو میں اضافہ کیا اور انہیں اپنے ذاتی فوائد کے لئے استعمال کیا۔ اس دائرہ کار میں عام لوگ ریاستی مراعات سے محروم کر دئے گئے۔ حکمراں طبقوں نے اپنے اختیارات کو نہ صرف ریاست کے اندر رہتے ہوئے تکون شکل دے کر انہیں بطور موثر ہتھیار کے اپنایا۔ اور اپنے اقدامات کو اخلاقی اور دستوری رنگ دیا۔ اس کے علاوہ ریاست کے باہر بھی انہوں نے ملک کے ذرائع کو ہتھیا کر ان کی دولت پر قبضہ کیا اور اس ذریعہ سے اپنے اثرات اور طاقت کو بڑھایا۔

قومی مفادات کے نام پر حکمراں طبقے کس قدر خوں ریزی کرتے ہیں۔ انسانیت کا خون بہاتے ہیں۔ اور تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہیں۔ اس کی مثال یورپ کی قومی ریاستیں اور ان کے اختلافات ہیں۔ بیسویں صدی میں جب یہ یورپی قومی ریاستیں ایشیاء و افریقہ کے ملکوں پر قبضہ کر رہی تھیں تو اس وقت پوری ریاست کی خواہش تھی کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ کر کے اس کے ذرائع کو غصب کرنا ان کی قوم کے مفاد میں ہے۔ جب ملکوں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ بڑھا تو اس نے پہلی جنگ عظیم کی ابتداء کی کیونکہ انگلستان، فرانس، جرمنی اٹلی اور دوسری ریاستیں ایک دوسرے سے بڑھ کر ایشیاء و افریقہ کے ملکوں پر قبضہ کی خواہش مند تھیں ان کے قومی مفادات میں جب ٹکراؤ ہوا تو اس کے نتیجہ میں خوں ریز جنگ ہوئی۔ اس نے آگے چل کر دوسری جنگ عظیم کی بنیاد ڈالی جس میں امریکہ کے بھی بھرپور شوکت کی۔ ان دونوں جنگوں میں قومی مفادات کے نام پر لاکھوں لوگوں کا خون بہایا گیا۔ شہروں کو اجاڑا گیا۔ اور انسانیت کو زخمی و لہولہان کیا گیا۔

اس دلیل کی بنیاد پر برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اس کے خلاف ہونے

والی مزاحمتوں، بغاوتوں اور احتجاجوں کو قومی مفاد کے نام پر سختی سے کچلا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں اس جذبہ کے تحت انہوں نے باغیوں کو پھانسی دی۔ گولیوں سے بھونا، توپ سے باندھ کر اڑایا۔ سزاؤں میں وہ اس حد تک گئے کہ ذرا ذرا سے شبہ میں معصوم شہریوں کو بھی نہیں بخشا۔ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کو اس دلیل کے تحت جائز قرار دیا گیا کہ اس نے برطانوی حکومت کو تحفظ دیا، ورنہ ہندوستانی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ لہٰذا امن وامان اور قانون کی بالادستی کے لئے یہ قتل عام لازمی تھا۔ تاکہ لوگ حکومت مخالف تحریکوں سے دور رہیں۔ ڈائر جو اس قتل عام کا ذمہ دار تھا اسے برطانوی ایمپائر کا ہیرو قرار دیا گیا اور اس کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے۔ برطانیہ میں اس کا استقبال قومی ہیرو کے طور پر کیا گیا۔

آزادی کے بعد پاکستان کے حکمراں طبقوں نے اس کولونیل پالیسی کو جاری رکھا اور قومی مفادات کے نام پر ریاستی اداروں کو اپنے ذاتی مقاصد پورا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اگر کسی نے ان کی مخالفت کی ان کی پالیسیوں پر تنقید کی انکے کرتوتوں کو سامنے لائے تو اس صورت میں انہیں مفسد، غدار، سازشی، امن وامان کو تباہ کرنے والا اور غیر ملکی ایجنٹ کہا جو قومی مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں اور ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

لہٰذا ان افراد کو سزا دینا۔ قید و بند میں رکھنا اور ان پر غداری کے مقدمے چلانا، یہ سب قومی مفاد میں آ جاتا ہے اور اس کی قانونی اور دستوری حیثیت ہو جاتی ہے۔

قومی مفاد کے تاثر کو لوگوں میں مقبول بنانے کے لئے ایسے نعروں اور بیانوں کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگوں کے جذبات کو ابھاریں اور انہیں مشتعل کریں۔ لہٰذا کہا جاتا ہے کہ ملک میں قانون کی بالادستی ملک کی سیکورٹی اور امن وامان برقرار رکھنے کے لئے مخالف قوتوں کے خلاف اقدامات لینا ضروری ہے۔ اسی بنیاد اور نظریہ پر قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے اقدامات کو جائز سمجھتے ہیں۔ اگر لوگ اپنے بنیادی حقوق کے حصول کا مطالبہ کرتے ہیں، مہنگائی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں، بدعنوانیوں پر احتجاج کرتے ہیں اور انصاف کے طلب گار ہوتے ہیں تو ان کے مظاہروں، سٹرائیکوں اور احتجاج کو قومی مفاد کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور پولیس ان پر لاٹھی چارج کرتی ہے، آنسو گیس پھینکتی ہے اور

مظاہرین کو گرفتار کر کے حکومت کے خلاف تنقید پر مقدمے چلاتی ہے۔

مزید برآں قومی مفاد کے نام پر لوگوں کے ٹیلی فون ٹیپ کئے جاتے ہیں۔ خطوط کو سنسر کیا جاتا ہے سیاسی خالفین کی نگرانی کی جاتی ہے۔

اگر دیکھا جائے تو ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح ہو کر آتی ہے کہ سابق مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا، اس کا تعلق قومی مفادات سے نہیں تھا بلکہ یہ حکمراں طبقوں کے مفادات تھے کہ جنہوں نے فوجی ایکشن کرایا۔ اس میں کچھ سیاستدانوں کا بھی مفاد تھا۔ جو مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کے ساتھ مل کر حکومت بنانا اور بحیثیت اکثریت کے ان کو اقتدار میں شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے یہ ترجیح دی کہ وہاں فوج کو بھیج کر لوگوں کی مزاحمت کو کچلا جائے۔ اس کی وجہ سے ہزارہا لوگ مارے گئے، یہ وہ لوگ تھے جو اس وقت تک پاکستانی قوم کا حصہ تھے، اور یقیناً یہ قومی مفاد میں نہیں تھا کہ ان کا قتل عام کیا جائے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تاریخ کے بارے میں ہم اپنی رائے اور نقطۂ نظر کو درست کریں۔

دیکھا جائے تو پاکستان میں چاہے آمرانہ حکومتیں ہوں یا جمہوری، دونوں صورتوں میں قومی مفاد کے نام پر طاقت ور حکمراں طبقے اپنے مقاصد پورے کرتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ قومی مفاد کے اس تصور کا دوبارہ تجزیہ کیا جائے۔ اس کے استعمال کو دیکھا جائے اور اس کے ذریعہ جس طرح عوام کا استحصال ہوتا ہے اسے روکا جائے۔

عوام کے نام پر

موجودہ دور میں عوام کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے۔اب ہمارے حکمراں بھی اس مقبولیت سے متاثر ہو گئے ہیں اور عوام کو اپنے پسندیدہ نعروں میں شامل کر لیا ہے۔اگر آپ ذرا غور کریں تو احساس ہو گا کہ حکمرانوں کو کائی حلقہ ایسا نہیں ہے جو عوام کی محبت میں گرفتار نہ ہو۔سیاستداں مسلسل اس بات کا وعدہ کر رہے ہیں کہ وہ عوام کو روٹی، کپڑا، اور مکان دیں گے ان کے لئے ہسپتال تعمیر کرائیں گے۔سفر کی سہولتوں کے لئے ریل اور بسوں کا انتظام کریں گے۔پولیس کے عہدے دار اس بات کو بار بار دہرا رہے ہیں کہ وہ جرائم کا خاتمہ کر کے قانون کی بالادستی قائم کریں گے۔ایسا قانون کہ جس میں امیر وغریب سب برابر ہوں گے۔ہمارے افسراں اور نوکر شاہی کے عہدیدار بضد ہیں کہ عوام کی شکایات دور کریں گے اور فوجی جنرل صاحبان عوام کے تحفظ کے لئے ہتھیاروں سے لیس ہو گئے ہیں۔

عوام سے یہ محبت سطروں تک ہی نہیں رہی ہے بلکہ اب تو ٹرینیں بھی عوامی ہو گئی ہیں۔سیاسی جماعتیں بھی عوامی کا لفظ استعمال کرنے لگی ہیں۔ہسپتال، سکول اور کالجز بھی عوامی ہو گئے ہیں۔یہاں تک کہ لباس کو بھی عوامی بنا دیا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر عوام سے یہ محبت اور ہمدردی کیوں ہے؟

اس فرق کی وجہ موجودہ دور میں جمہوری روایات اور اداروں کا فروغ ہے کہ جنہوں نے عوام میں سیاسی شعور اور آگہی پیدا کر دی ہے۔اب عوام کو نہ صرف ووٹ کی طاقت مسیر ہے بلکہ وہ ردعمل کے طور پر جلسے، جلوس، اور مظاہرے بھی کرنے لگے ہیں۔ یہ صورت حال اس سے مختلف ہے کہ جو بادشاہت کے زمانے میں حکمرانوں اور عوام میں تھی۔

بادشاہ اور عوام کے درمیان بڑا فرق ہوا کرتا تھا۔ اس وقت عوام اس کی رعیت ہوا کرتے تھے کہ جن کا فرض تھا کہ وہ حکمراں کی اطاعت کریں۔ اس کے احکامات کو فرماں برداری سے ادا کریں۔ اور اس کی خدمت میں بلاچون و چرا ٹیکس ادا کرتے رہیں۔ اگر حکمراں ان کی فلاح کے لئے کچھ اصلاحات کرتا تھا تو یہ اس کی مہربانی ہوا کرتی تھی۔ وہ رعیت کے لئے مائی باپ کا درجہ رکھتا تھا۔

جب ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت بھی حکمرانوں اور رعیت میں یہ فرق قائم رہا۔ لیکن آزادی کے بعد جب رعیت یا عوام شہری ہوئے اور انہیں دستور میں بنیادی حقوق دئے گئے تو ان کی حیثیت بدل گئی۔ لیکن ہمارے حکمرانوں کے ذہن میں اب تک عوام کے لئے رعیت کا تصور ہے۔ وہ موجودہ حالات کے تحت اس بات پر مجبور تو ہیں کہ ہر بات میں عوام کا ذکر کریں لیکن عوام کی فلاح و بہبود کے پس منظر میں خود ان کے مفادات ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ روٹی، کپڑا، اور مکان کا نعرہ 1970 سے آج تک چلا آ رہا ہے۔ کیونکہ عوام آج بھی مفلسی اور غربت کا شکار ہیں۔ جیسے کہ وہ ملک کے قیام کے وقت تھے۔

ہمارے حکمرانوں کو عوام کے مسائل کا ادراک اس لئے نہیں ہے کہ وہ ان سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔ اگر وہ بیمار ہوتے ہیں تو علاج کی غرض سے یورپ اور امریکہ چلے جاتے ہیں۔ اگر ملک میں تعلیمی معیار گر رہا ہے اور تعلیمی اداروں میں تعلیم ختم ہوگئی ہے تو وہ اپنے بچوں کو بیرون ملک تعلیم کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اگر انہیں منڈی یں ملاوٹ کی اشیاء ملتی یں تو وہ معیاری اور خالص چیزیں باہر کے ملکوں سے منگواتے ہیں۔ اگر ملک میں لاقانونیت ہوتی ہے اور لوٹ مار کا خطرہ ہوتا ہے تو وہ اپنے لئے حفاظتی گارڈ رکھ لیتے ہیں۔ اگر ملک یں سخت گرمی ہو تو وہ سوئٹزر لینڈ یا کسی دوسرے سرد ملک میں جا کر چھٹیاں گزار لیتے ہیں۔ یہ سیاسی راہنما اب اکثر تھری پیس سوٹ میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہر جگہ اور ہر وقت ایئر کنڈیشنر میں رہتے ہیں۔

لہٰذا ان کے لئے عوام کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ انہیں جذباتی نعروں میں الجھائے رکھا جائے ان کے نام پر حکومت کی جائے۔ جب بار بار عوام کے نام کو

استعمال کیا جاتا ہے تو درحقیقت عوام سمجھنے لگتے ہیں کہ شاید ملک میں ان کی حکمرانی ہے۔ اس نشہ میں ان کو مبتلا کر کے ہمارے یہ حکمراں اپنی من مانی کرتے ہیں۔ ملک کو لوٹتے ہیں۔ عیش و آرام کرتے ہیں اور اگر کبھی عوام ان کے رویوں سے تنگ آ کر مظاہرہ کرتے ہیں، تو یہ عوام کے مفاد کے لئے، ان پر لاٹھی چارج کر کے ان کے احتجاج کا خاتمہ بھی کرتے ہیں۔

لہٰذا اس جمہوری دور میں عوام کے نام پر جو آمرانہ طرزِ حکومت اختیار کیا گیا ہے، اس کے پس منظر میں سیاسی راہنماؤں اور اقتدار پر قابض افراد کے اپنے مقاصد ہیں، جو وہ پورے کر رہے ہیں۔ عوام کا نام لے کر اپنے ہر جائز اور ناجائز قدم کو صحیح قرار دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر عوام کب تک اس منافقت کو برداشت کریں گے؟ کیا وہ وقت آئے گا کہ جب وہ اس دوغلے پن کو پہچان کر اس کا قلع قمع کریں گے؟ یقیناً یہ تبدیلی ضرور آئے گی کہ جب عوام کے نام پر دھوکا کرنے والوں کو احتساب ہوگا۔

عوامی مزاحمت

جب سے انسانی تہذیب میں طبقاتی نظام کی ابتداء ہوئی ہے اس نے طاقت ور اور مراعات یافتہ طبقے، اور محروم اور کمزور لوگوں کے درمیان فرق پیدا کر دیا ہے۔ اس فرق کو قائم رکھنے، اور اسے اخلاقی جواز دینے کے لئے حکمراں اور بالا دست طبقے دو طریقوں سے اپنے اثر ورسوخ کو قائم رکھتے ہیں۔ اول زبردست طبقوں کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ان کی حیثیت عین فطرت کے اصول کے مطابق ہے۔ لہٰذا اس کو ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے مذہبی اعتقادات، اور سیاسی قوانین کا سہارا لیا جاتا ہے۔ سماج میں اس قسم کی روایات کو پروان چڑھایا جاتا ہے رسم ورواج اور کلچرل اثرات سے اس خیال کو تقویت دی جاتی ہے کہ نچلے طبقوں کو حالات سے سمجھوتہ کر کے رہنا چاہئے۔

لیکن یہ بھی انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ ناانصافی اور استحصال کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور جب وہ حالات کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو ان کو قابو کرنے کے لئے دوسری صورت میں فوجی قوت و طاقت ہوتی ہے تا کہ ان کی مزاحمت اور بغاوت کو کچل دیا جائے۔ اگر بغاوت کبھی کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ انقلاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور پورے نظام کو الٹ کر ایک نئے نظام اور ایک نئے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔ اگر ناکام ہوتی ہے تو اس کو اس قدر ظالمانہ طریقہ سے کچلا جاتا ہے کہ دوسروں کے لئے باعث عبرت ہو، اور ایک طویل عرصہ تک مزاحمت کے جذبات نہ ابھرنے پائیں۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ عوام کی بغاوت صرف سیاسی ہی نہیں ہوتی ہے یہ سماجی اور ثقافتی بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا جب بھی بغاوت کے نتیجہ میں قانون، انتظامی نظم ونسق ٹوٹتا ہے، قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کمزور ہو کر یا شکست کھا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تو اس وقت عام لوگوں کو اپنی حقیقی آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ مجمع میں ہوتا ہے تو اس وقت اس کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس کا حصہ بن کر طاقت وقوت کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ جب وہ بالا دست طبقوں کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار

کرتا ہے۔ یہ اظہار تشدد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہر اس شے اور نشان کو مٹا دینا چاہتا ہے کہ جس کا تعلق اس کے مخالف طبقوں سے ہوتا ہے۔ ان کا خاتمہ اس کو ناانصافی، ظلم اور استحصال آزاد ہونے کی خوش خبری دیتا ہے۔

اس کی ایک مثال ہم فرانس کے انقلاب (1789) میں دیکھتے ہیں۔ جب وہاں قانون کی بالادستی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ وہ قانون کہ جس کے فوائد حکمراں طبقوں کو تھے، حکومت کا نظم و ضبط ٹوٹ جاتا ہے، جس کے ذریعہ لوگوں کو اطاعت گزار بنا کر رکھا جاتا تھا۔ اور بادشاہ کا رعب و دبدبہ اور شان و شوکت ماند پڑ جاتی ہے۔ تو پیرس کے عوام خود کو قانونی، انتظامی اور رسم و رواج کے بندھنوں سے آزاد پاتے ہیں۔ یہ آزادی کا روس تھا کہ مجمع میں اتنی طاقت اور قوت بھر دی کہ اس نے بیسٹل کے مضبوط و مستحکم قلعہ کو مسمار کر دیا۔

جب دیہاتوں میں زمینداروں اور جاگیرداروں کا اثر و رسوخ ٹوٹا تو کسان اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ان کی حویلیوں کو آگ لگا دی۔ اور ان دستاویزات کو جلا دیا کہ جس میں ان کے قرضوں اور ٹیکسوں کی تفصیلات تھیں۔ یہ عام لوگوں کا غم و غصہ تھا جو پیرس اور فرانس کے دیہاتوں میں ابھرا۔

اس عوامی بغاوت کی جھلکیاں ہمیں 1857 میں بھی نظر آتی ہیں۔ جب فوج میں بغاوت ہوئی۔ اور اس نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو یہ افواہ تیزی سے پھیلی کہ انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اس کا فوری ردعمل یہ تھا کہ اگر اس کا خاتمہ ہو گیا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کا قانون، انتظام اور نظم و نسق بھی ختم ہو گیا ہے۔ شمالی ہند کے لڑکے گاؤں اور دیہاتوں میں کہ جہاں کسانوں سے زیادہ سے زیادہ ریونیو لیا جا رہا تھا۔ اور جب وہ ادائیگی نہ کر پاتے تھے تو ان کو اپنی زمینیں ساہوکاروں کے پاس رہن رکھ کر قرضہ لینے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ لہٰذا ان کے لئے کمپنی کی حکومت اور اس کے زیر سایہ ساہوکار دونوں ان کے دشمن تھے۔

اس لئے جب انگریزی حکومت کے خاتمہ نے ان کو انتظامی سختیوں سے آزاد کیا تو جگہ جگہ دیہاتی چھوٹے زمیندارو کی سربراہی میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اپنی آزاد حکومتیں قائم کر لیں۔ گوتم بھادر نے اپنے ایک مقالہ ''اٹھارہ سو ستاون کے چار باغی''
(Four Rebels of Eighteen Fifty-seven, Subaltern studies iv. pp. 229-275) میں سے وہبی سنگھ کا ذکر کیا ہے۔ جو متھرا کے

قریب واقع دریا کا رہنے والا تھا، جب اس نے کمپنی کی حکومت کے خاتمہ کی خبر سنی تو اپنی خودمختاری کا اعلان کرتے ہوئے سب سے پہلے تو ساہوکاروں کے گھروں پر حملہ کر کے ان کے بہی کھاتوں کو ضائع کیا۔ اس کے بعد ان کے مال و دولت کو لوٹا۔ اگرچہ دیہات کے عوام کی آزادی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہی۔ کیونکہ جلدی کمپنی کی فوج نے اس کا خاتمہ کر کے اس کو پھانسی دے دی۔ مگر اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کامیابی کی امید، انگریزی حکومت کے خاتمہ کی افواہ اور ناانصافی کے خلاف جذبات نے بہت جلد کسانوں کو ساہوکاروں، سیٹھوں، دولت مندوں اور حکومت کے عہدے داروں کے خلاف کر دیا۔ تبدیلی کی خواہش نے ان میں توانائی، اعتماد اور طاقت پیدا کر دی۔

دوسری مثال گوتم بہادر نے مولوی احمد اللہ کی دی ہے کہ جب انہوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ لکھنو پر قبضہ کیا تو پہلی مرتبہ عام لوگوں کو اپنی طاقت کا احساس ہوا۔ اس کا اظہار اس سے ہوا کہ انہوں نے نہ صرف امراء کا مذاق اڑایا، ان پر فقرے کسے، انکی دولت کو لوٹا، بلکہ زندگی میں جو محرومیاں تھیں، ان کو دور کرنے کے لئے اچھے کھانے کھائے اور اسلحہ کی نمائش کرتے ہوئے اپنی قوت کا اظہار کیا۔ عام لوگوں کے اس رویہ سے لکھنو کی اشرافیہ کو اپنی حیثیت اور مراعات خطرے میں نظر آئیں۔ اس لئے انہوں نے حضرت محل کی سربراہی میں برجیس قدر کو بادشاہ بنا کر عام لوگوں کی بغاوت کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ 1857 کی بغاوت صرف کمپنی کی حکومت کے خلاف ہی نہیں تھی بلکہ یہ اس قدیم نظام کے بھی خلاف تھی کہ جس میں حکمراں طبقوں نے تمام مراعات خود حاصل کر لیں تھیں۔ اور لوگوں کے بے سہارا چھوڑ دیا تھا۔ اس لئے لاقانونیت، اور کمپنی کی حکومت کے خاتمہ نے محروم اور زیردست طبقوں میں جو آزادی کی امید پیدا کی تھی، اس کا اظہار لکھنو اور دہلی میں بھی ہوا۔ اور دیہاتوں میں کسانوں کی جانب سے بھی ہوا۔

یہی وجہ تھی کہ چند بڑے زمینداروں اور حکمرانوں کو چھوڑ کر کہ جن کی حکومتیں اور مراعات چھین لی گئیں تھیں راجاؤں نوابوں اور اشرافیہ نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھ سکیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ بغاوت کے خاتمہ کے بعد "انگریزی حکومت نے راجاؤں نوابوں اور زمینداروں کی مدد سے ہندوستان میں اپنے اقتدار کو مستحکم کیا۔

پاکستان کی سیاسی زبان

پاکستان کی تاریخ میں ہمارے حکمرانوں نے ایک سیاسی زبان کی تشکیل کی ہے جو مسلسل ساٹھ سال سے استعمال کی جارہی ہے۔ اقتدار میں آنے والا ہر فرد جب صدارت یا وزارت عظمی پر فائز ہو کر قوم سے خطاب کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بیان کو دہرا رہا ہے جو اس سے پہلے بار بار دہرایا جاتا رہا ہے۔ اس بیان میں کہیں کہیں ذرا معمولی سی ردو بدل ہوتی ہے ورنہ اس کا مفہوم ایک ہی رہتا ہے۔

مثلاً ہر نیا صدر یا وزیر اعظم جب ملک اور سماج کی مشکلات اور مسائل کو بیان کرتا ہے تو ان کی ساری ذمہ داری وہ پچھلی حکومت پر ڈال دیتا ہے کہ جس کے نالائق، بدعنوان اور عوام دشمن حکمرانوں نے اس ملک کو لوٹ کھسوٹ کر پس ماندہ کر دیا۔ اگر صدر فوجی ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری سیاستدانوں پر ہوتی ہے کہ جو جوڑ توڑ اور سازشوں میں مصروف رہے اور انہوں نے ملک کی ترقی کے لئے کچھ نہیں کیا۔ خاص طور سے ہر ایک اس بات کا ذکر ہوتا ہے کہ ملک کا خزانہ خالی ہو گیا، اور ملک کو بیرونی قرضوں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد وعدہ کیا جاتا ہے کہ ملک کے ان بدعنوان حکمرانوں سے عوام کی ایک ایک پائی وصول کی جائے گی اور ملک کو بیرونی قرضوں سے نکال کر کشکول توڑ دیا جائے گا۔

اس کے بعد ہر دور میں حکومت اور برسرِ اقتدار طبقوں کی جانب سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ "پاکستان ایک نازک دور سے گزر رہا ہے" یہ نازک دور 1947 سے شروع ہوا ہے اور اب تک جاری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صرف صاحب اقتدار اسے نازک دور سے نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نازک دور کے ساتھ ساتھ یہ اعلان بھی کیا جاتا ہے کہ ملک کی سالمیت کو خطرہ ہے۔ اور اسے ہر قیمت پر برقرار رکھا جائے گا۔ سالمیت کے اس خطرے کے پیش نظر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کا دفاع ذمہ دار ہاتھوں میں ہے، اس لئے

عوام کو گھبرانے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ سالمیت کے خطرے کے تحت چھوٹے صوبوں سے کہا جاتا ہے وہ حقوق مانگنے سے پرہیز کریں، کیونکہ اس سے ملک کا استحکام کمزور ہوتا ہے۔

ملک کے استحکام اور تحفظ کے بعد عوام کا نمبر آتا ہے۔ انہیں بار بار یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ ان کے مسائل سے حکومت آگاہ ہے، اور تمام انتظامات مکمل کر لئے گئے ہیں کہ اب انصاف عوام کی دہلیز پر فراہم کیا جائے گا۔ مہنگائی دور کی جائے گی، غربت کا خاتمہ ہوگا، روزگار کے مواقع فراہم ہوں گے اور تعلیم کے دروازے سب پر کھل جائیں گے۔

لیکن جب لوگ اپنے مطالبات کے لئے سڑکوں پر آجاتے ہیں۔ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ تو یہ عوام اچانک ملک دشمن، اور شرپسند ہو جاتے ہیں کہ امن و امان کو برباد کرنے والے اور ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچانے والے ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ سختی سے نمٹا جائے گا۔ اور یہ سختی ہوتی ہے کہ جب پولیس ان پر لاٹھیاں برساتی اور آنسو گیس پھینکتی ہے۔

اگر ملک میں کوئی حادثہ پیش آجائے یعنی بموں کا دھماکا ہو جائے یا ٹرینوں کا تصادم ہو جائے تو فوراً کہا جاتا ہے کہ اس میں غیر ملکی ہاتھ ہے۔ غیر ملکی ہاتھ ہونے کی وجہ سے جو لوگ حادثہ کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ صاف بچ جاتے ہیں اور مزید تحقیق کی نوبت نہیں آتی ہے۔

اگر حکومت سے کوئی جماعت یا افراد مطالبات کرتے ہیں تو ان کے لئے کہا جاتا ہے کہ ملک دشمن ہیں، اور غیر ملکی ایجنٹ ہیں جو حکومت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ ایک زمانے میں غیر ملکی ایجنٹ کمیونسٹ ہوتے تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ روس کے لئے کام کر رہے ہیں۔ اب انڈین ایجنٹ ہیں۔ جو ملک کو توڑنے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔

لہٰذا ان سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہماری جاسوسی ادارے مضبوط ہوں، ملک میں مخبروں کا جال بچھا ہو، جو ایسے افراد کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ اور ان کے مذموم عزائم کو پورا نہیں ہونے دیں۔ لہٰذا ملک کے تحفظ کے لئے یہ اعلان کیا جاتا

ہے کہ یہ ایک نظریاتی ملک ہے۔ اس لئے نظریہ کی حفاظت کے لئے ریاست کے تمام اداروں کو سرگرم عمل رہنا چاہئے۔ اس بات پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ محاذ آرائی کی سیاست کو ختم کردینا چاہئے۔

سیاستدانوں کی جانب سے جو زبان استعمال ہوئی ہے، اس میں اس بات و دہرایا جاتا ہے کہ ملک میں عوام کی حاکمیت قائم کی جائے گی، جمہوری اداروں کو مضبوط کیا جائے گا۔ اور چونکہ یہ ملک اسلام کے لئے بنا ہے اس لئے اسے اسلام کا قلعہ بنا دیا جائے گا۔

ساٹھ سالوں میں سیاسی زبان، میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔ حکومتیں چاہے فوجی ہوں یا جمہوری، ان دونوں میں کوشش کی جاتی ہے کہ اس زبان کے ذریعہ لوگوں کے جذبات کو ابھارا جائے، انہیں نیشنل ازم کے نام پر مشتعل کیا جائے اور ان کے بنیادی مسائل سے الگ ہٹ کر ان کو سہانے خواب دکھائے جائیں۔

سیاسی زبان کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ صاحب اقتدار اور سیاستدان عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے زبانی وعدوں اور خوبصورت الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن جب عوام اپنے حقوق کے لئے سڑکوں پر آتے ہیں تو پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے امن وامان کی بحالی اور دہشت گردوں کے خلاف مسلح ہو کر سامنے آ جاتے ہیں اور قانون کے نام پر مظاہرین پر ہر قسم کا تشدد جائز ہو جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی زبان کی تہہ میں ان کے مفادات ہوتے ہیں۔ انہیں عوام سے کوئی زیادہ غرض نہیں ہوتی ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے تو اس وقت انہیں استعمال کیا جاتا ہے اور پھر راستہ سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔

خودکش حملے اور خودکشی

پاکستان اس وقت دو قسم کی خودکشیوں سے دو چار ہے۔ ایک خودکش حملے اور دوسرے غریب اور مفلس لوگوں کی خودکشیاں۔ خودکش حملے پاکستان میں نہیں جانے جاتے تھے۔ سری لنکا کو چھوڑ کر کہ جہاں تامل باغیوں نے اسے استعمال کرنا شروع کیا، مسلمان ملکوں میں فلسطین اور چیچنیا میں اس کا استعمال ہوا۔ اور جب عراق اور افغانستان میں امریکی اور ان کے حلیف قابض ہوئے وہاں خودکش حملے بطور مزاحمت استعمال ہونا شروع ہوئے۔ اب جیسے جیسے مقبوضہ ملکوں میں قابض طاقتوں کی جانب سے بربریت کا مظاہرہ ہو رہا ہے اسی طرح سے ان ملکوں میں خودکش حملے بڑھ رہے ہیں۔ ان حملوں کے پس منظر میں مذہبی اور سیاسی دونوں قسم کے نظریات ہیں۔

پاکستان میں خودکش حملوں کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب کہ حکومت نے امریکہ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ یہ حملے حکومت کی ایجنسیوں اور عمارتوں پر ہو رہے ہیں۔ ان حملوں ک دو مقاصد ہیں۔ ایک تو قابض فوجیوں اور ان کے حمایتوں میں خوف ہراس پیدا کرنا، انہیں ہلاک کرنا اور عام شہریوں کو یہ پیغام دینا کہ وہ موجودہ نظام کی حمایت نہ کریں اور ان کے ساتھ تعاون نہ کرتے ہوئے ان سے دور رہیں۔ دوسرے وہ ایک ایسی بحرانی صورت حال پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے باعث قابض طاقتوں اور ان کے حواریوں کے لئے حکومت کرنا مشکل ہو جائے اور جب بحران بڑھے تو ملک کے عوام ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

اس لئے خودکش حملوں کو محض مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، ان کے پس منظر میں جو سیاسی مقاصد ہیں۔ ان کو نہیں بھولنا چاہئے۔ اب یہ کوشش ہوتی ہے کہ علماء سے فتویٰ لے کر یہ باور کرایا جائے کہ خودکش حملے مذہب کی تعلیمات کی رو سے غلط ہیں، یہ زیادہ

موثر نہیں ہوگا، کیونکہ اصل وجہ بیرونی طاقتوں کا قبضہ اور ملکوں کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی ہے، جب تک یہ ختم نہیں ہوگی۔ اس وقت تک خودکش حملوں کی وجہ بھی ختم نہیں ہو گی۔ اس خاص وجہ پر اس لئے بات نہیں کی جاتی ہے کیونکہ غیر ملکی طاقتیں مقبوضہ علاقوں سے جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

خودکش حملوں کے ساتھ ساتھ اب ہمارے ہاں خودکشی کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ خودکشیاں دو قسم کی ہیں۔ اول وہ لوگ خود کو مارنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ جو غربت، مفلسی، اور بے چارگی کی زندگی سے تنگ آ جاتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ بھی ہیں کہ جنہیں سماج میں انصاف نہیں ملتا ہے اور وہ حالات سے اس قدر مایوس اور ناامید ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے زندگی کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ جو لوگ غربت، مفلسی اور ناانصافی سے تنگ آ کر خودکشی کرتے ہیں ان کی ذمہ داری کن پر ہے؟ یقیناً حکمران طبقوں پر کہ جنہوں نے ملک کی تمام دولت کو اپنے لئے سمیٹ لیا ہے، تمام مراعات کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے اور لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ ایسی صورت میں جب ایک اقلیت کو خوش حالی اور لطف اندوزی کی تمام سہولتیں میسر ہوں اور دوسری طرف محرومیاں اور مایوسیاں ہوں تو ان کا ذمہ دار کون ہو گا؟ کیا ایسی مجبور اور بے کس قوم کے تحفظ کے لئے ہمیں جدید اسلحہ سے لیس فوج کی ضرورت ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جو لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے خودکشی کے واقعات میں وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہوتی ہیں کہ جنہیں پسند کی شادی نہیں کرنے دی جاتی۔ برادری اور قبائلی روایات ان کی راہ میں آ جاتی ہیں جو ان کو زندگی سے مایوس کر دیتی ہیں۔ ہمارا سماج ماضی کی روایات کو مقدس بنا کر ان کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس قربانی کو قبول کر لیتا ہے کہ خودکشی کی صورت میں اس کی بھینٹ چڑھتی ہے۔

ریاست خودکش حملوں کی مذمت تو کرتی ہے کیونکہ یہ اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ یہ اس کی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں۔ مگر ریاست ان خودکشیوں پر شرمندہ نہیں ہوتی ہے کہ جو اس کے پیدا کردہ حالات کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ریاست کی یہ

ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ہر شہری کی رہائش اور غذا کی ذمہ داری پوری کرے۔ اسے تحفظ دے اگر وہ اس میں ناکام ہوتی ہے تو وہ ریاست لوگوں کے لئے نہیں چند مفادات پرست طبقوں کے لئے ہوتی ہے۔ ایک ایسی ریاست کے لئے غریبوں کی خودکشی باعث شرم ہونا چاہئے اور حکمراں طبقوں کی مراعات سے نکل کر اپنے دائرہ کو وسیع کرنا چاہئے۔

روایات کے خلاف خودکشی میں برادری اور قبائل کے رسم و رواج حائل ہوتے ہیں۔ حالات کے تحت اور تعلیم کے ذریعہ ان میں آگہی آنی چاہئے کہ روایات مقدس نہیں ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ بدلتی ہیں، اور اس لئے انہیں ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے۔

سیاست اور لوگ

تاریخ میں حکمراں طبقے ہمیشہ لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور انہیں جذباتی طور پر اس طرح سے مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان مقاصد کی اصلیت کو جانے بغیر اپنی جان دیدیتے ہیں، اگر ہم دنیا کی تاریخ میں جنگوں کے بارے میں حقیقت کو دیکھیں تو یہ جنگیں حکمران طبقوں کے سیاسی، اور معاشی مقاصد کے لئے ہوتی تھیں۔ کبھی ان کے ذریعہ وہ دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کی توسیع کرتے تھے اور کبھی دوسروں کے مال و دولت کو لوٹ کر اپنے خزانے بھرتے تھے۔ مگر عام فوجیوں کو جن جذبات پر خیالات اور لڑایا جاتا تھا، وہ کبھی مذہبی ہوتے، تو کبھی نسل پرستی، قوم پرستی اور تہذیبی برتری کا ہوتے تھے۔ ستم ظریفی یہ ہوتی تھی کہ جنگوں میں فتح کسی جرنل یا کمانڈر کے نام سے ہوتی تھی۔ اور اب عام فوجیوں کی قربانی کا صلہ یہ ہے کہ اکثر ملکوں میں ''گمنام فوجی'' کی یادگار بنا کر، اس پر رسماً پھولوں کی چادر چڑھادی جاتی ہے۔

موجودہ زمانے میں سیاسی آگہی کے ساتھ عام فوجیوں میں یہ احساس ہوگیا ہے کہ انہیں حکمراں طبقے اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس لئے ان میں کچھ ہمت کر کے ایسی جنگوں میں لڑنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال کچھ امریکی فوجیوں کی ہے کہ جنہوں نے ویت نام میں لڑنے سے انکار کیا اور اس کے بدلے میں قید و بند کی سزا کاٹی۔ اس وقت عراق کی جنگ میں بھی کئی فوجی ہیں جنہوں نے جنگ میں حصہ لینے سے انکار کیا، اور کینیڈا یا دوسرے یورپی ملکوں میں سیاسی پناہ لے رکھی ہے۔

جنگ کے علاوہ سیاستداں، جب سیاسی فیصلے کرتے ہیں، اور ان کے نتیجہ میں جو تنازعات پیدا ہوتے ہیں ان کا شکار بھی عام لوگ ہوتے ہیں، مثلاً کولونیل حکومتوں نے جب اپنی کالونیز کو آزاد کیا تو اس کے نتیجہ میں اپنے مقاصد کے تحت ان ملکوں کی سرحدیں

متعین کر دیں، جن کی وجہ سے آج تک ان ملکوں میں خانہ جنگی یا فسادات جاری ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی مثال کشمیر کا جھگڑا ہے۔ کوریا کو تقسیم کیا گیا، قبرص بھی دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ کردوں کا مسئلہ ایران، شام، ترکی، عراق اور ایران کے درمیان فساد کا باعث ہے، کیونکہ سرحدوں کی تبدیلی میں ان کی آبادی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ آج بھی وہ علیحدہ وطن کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اور سب سے بڑھ کر یورپی اقوام اور خصوصیت سے برطانیہ نے فلسطین میں اسرائیل کو قائم کر کے فلسطینی باشندوں کے قتل عام کو جاری رکھا ہوا ہے۔ ان ساٹھ سالوں میں لاکھوں کی تعداد میں یہ اپنی سرزمین چھوڑنے پر مجبور ہوئے، اور اسرائیل کی ریاست ان کا قتل عام کر کے ان کی جدوجہد کو کچلنے میں مصروف ہے۔ ان لاکھوں اور ہزاروں لوگوں کے خون کا حساب دینے والا کوئی نہیں؟

خاص طور سے ان ملکوں میں کہ جہاں آمرانہ حکومتیں قائم ہیں، یا جمہوریت کے نام پر غیر جمہوری طریقوں سے اقتدار بر پر قبضہ ہے، وہاں اگر لوگ اپنے حقوق کے لئے باہر نکلتے ہیں، جلسے وجلوس نکالتے ہیں، اور مظاہرے کرتے ہیں، تو حکمراں طبقے، ان کو سختی سے کچل دیتے ہیں۔ جنوبی افریقہ میں کہ جہاں اپارتھائڈ کی حکومت نسل پرستی پر قائم تھی، جب وہاں کے مقامی باشندے اپنے حقوق کے لئے مظاہرے کرتے تھے تو ان کو گولیوں سے بھون دیا جاتا تھا۔ یہی صورت حال ہمارے سامنے اس وقت برما (میانمیر) کی ہے کہ جہاں فوج کی حکومت ہے، جب بھی عوام تنگ آ کر سڑکوں پر آتے ہیں تو فوج ان نہتے عوام پر گولیاں برسا کر ان کا قتل عام کر دیتی ہے۔ اس عمل سے لوگ دہشت زدہ ہو کر کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں، مگر وقت گزرنے کے بعد پھر سڑکوں پر آتے ہیں، اور فوج کے ہاتھوں جان دیتے ہیں۔

یہ صورت حال افریقہ کے ان ملکوں میں ہے کہ جہاں یا تو فوجی حکومتیں ہیں، یا اقتدار پر قبضہ کے لئے مختلف مسلح گروہوں میں جنگ جاری ہے، جس میں عام لوگ مارے جاتے ہیں، ملک چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں، یا غربت و بے بسی کی زندگی گزارتے ہیں۔

لہٰذا تاریخ کے مطالعہ سے ہمارے سامنے جو حقیقت ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ

جہاں طاقت واقتدار، اور دولت کا سوال ہوتا ہے وہاں عام لوگوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ ان کو استعمال کیا جاتا ہے، جب یہ مقصد پورا کر دیتے ہیں تو انہیں مفلسی اور گمنامی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جمہوری ملکوں میں فرق یہ ہے کہ وہاں چونکہ عوام کو ووٹ کا حق ہوتا ہے، اس لئے ان کی اس وقت تک قدر کی جاتی ہے کہ جب تک ان سے ووٹ لیا جائے، اس کے بعد عوامی رائے کی کوئی اہمیت نہیں رہتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ عراق اور افغانستان کی جنگ کے خلاف امریکہ اور یورپ میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے، لاکھوں لوگ سڑکوں پر آئے، مگر ان کی بات کی حکمراں طبقوں نے پرواہ نہیں کی۔ فرق صرف رہا کہ ان پر گولیاں نہیں برسائی گئیں، انہیں پرامن طریقے سے مارچ کرنے دیا گیا، مگر عوامی مفادات کو ایک طرف رکھ کر حکمراں طبقوں کے مفادات پر عمل کیا گیا۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے، ہم کہہ نہیں سکتے کہ کبھی عوام اقتدار میں آئیں گے، یا اسی طرح وہ حکمرانوں کے ہاتھوں استعمال ہوتے رہیں گے؟

مہنگائی

اس وقت پاکستان میں لوگ مہنگائی کی وجہ سے بے انتہا پریشان ہیں۔ مہنگائی کا احساس اس وقت ہوتا ہے کہ جب آمدنی سے زیادہ اخراجات ہو جائیں۔ خصوصیت سے اگر کھانے پینے کی اشیاء مہنگی ہو جائیں اس کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی ضرورت زندگی کی بقا کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ورنہ دوسری چیزوں کے لئے انسان انتظار کرسکتا ہے۔ مثلاً لباس کے سلسلہ میں ایک یا دو جوڑوں میں بھی گزارا کر سکتا ہے۔ جب اشیائے ضرورت کی قیمتیں اچانک بڑھ جائیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ کون مہنگائی سے فائدہ اٹھاتا ہے؟

ایک تو مہنگائی کی ذمہ داری حکومت اور اس کے کارندوں پر آتی ہے۔ یہ فطری نہیں ہوتی ہے بلکہ اسے پیدا کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دار اور صنعت کار حکومت کے عہدے داروں سے مل کر ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں اور مصنوعی طور پر چیزوں کی قیمتیں بڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ ملکی منڈی کی ضروریات کو نہیں دیکھتے اور ان ملکوں میں اسمگل کرتے ہیں کہ جہاں سے انہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

جب مہنگائی حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور حکومت اس کو روکنے میں ناکام ہو جاتی ہے تو اس سلسلہ میں وہ عجیب وغریب قسم کی دلیلیں دیتی ہے مثلاً یہ کہ مہنگائی کا تعین عالمی صورت حال سے ہے۔ اس بحران کا شکار دنیا کے سارے ملک میں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مہنگائی کے جو اثرات سماج پر ہوتے ہیں اس کا تجزیہ نہیں کیا جاتا ہے۔

مثلاً جب آمدن سے زیادہ اخراجات ہوں گے تو اس کے نتیجہ میں لازمی طور پر بدعنوانی کو بڑھاوا ملے گا۔ وہ لوگ جو رشوت کے ذریعہ اپنے اخراجات پورے کر سکتے ہیں وہ

اس پر مجبور ہوں گے کہ رشوت کو اپنا ذریعہ آمدنی بنائیں۔ جو اس کے باوجود ایماندار رہنا چاہیں گے ان کے لئے اس کا حل یہ ہوگا کہ ایک وقت کھانا کھائیں یا ناشتہ نہ کریں۔ اس صورت میں ان کے خاندان کو صحت کے مسائل ہوں گے۔ بیماری کی صورت میں جو کچھ بچت کی ہوگی وہ ڈاکٹروں کے پاس چلی جائے گی۔ یا صحت کی خرابی ان کے کام کاج میں حارج ہوگی اور ان کی زندگی کی مدت کو کم کردے گی۔

اس کا ایک اثر سماجی زندگی پر ہوگا۔ چونکہ ہمارے ہاں شادی بیاہ یا تقریبات میں شرکت کرنی ہوتی ہے اور ان موقعوں پر تحفے تحائف بھی دینا ہوتے ہیں مگر جب بچت ہی نہ ہوگی تو اس صورت میں یا تو لوگ تقریبات میں جانا چھوڑ دیں گے یا قرض لے کر سماجی ضروریات پوری کریں گے، اس صورت میں ان پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا چلا جائے گا، جو انہیں ذہنی طور پر پریشان رکھے گا۔

مہنگائی کی وجہ سے لوگ صحت کے لئے متوازن غذا سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ وہ اس قابل نہیں ہوں گے کہ مہنگے پھل خریدیں۔ اس لئے ایک وقت وہ آئے گا کہ نوجوان ان کے ذائقہ سے ہی محروم ہو جائیں گے۔ دوسرے سستی اشیاء خریدنے کی وجہ سے وہ گلی سڑی سبزیاں اور پھلوں کو ترجیح دیں گے جو صحت کو بنانے کے بجائے اور خراب کرے گا۔

مہنگائی کی وجہ سے تاجر حضرات اشیاء میں ملاوٹ شروع کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے خالص اور ملاوٹ شدہ اشیاء میں فرق ہو جاتا ہے۔ کم آمدنی والے ملاوٹ شدہ اشیاء خریدتے ہیں کیونکہ یہ سستی ہوتی ہیں۔ جب کہ امیر حضرات خالص اشیاء خریدنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اکثر دودھ، جوس، پھل، اور سبزیاں غیر ممالک سے برآمد کی جاتی ہیں۔ جو طبقۂ اعلیٰ کے لئے مہنگے اسٹوروں میں ملتی ہیں۔

اس لئے اگر مہنگائی کے اثرات کو دیکھا جائے تو اس سے سماج کی اخلاقی قدریں تباہ ہوتی ہیں۔ ایمانداری اور نیکی کی کوئی قدر نہیں رہتی ہے۔ ان حالات میں وہ افراد کامیاب زندگی گزار سکتے ہیں کہ جن میں جارحانہ جذبات ہوں۔ جو لوگ شرافت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں انہیں ماحول ذلیل و خوار کر کے رکھ دیتا ہے۔ سماج میں اس کی عزت ہوتی ہے کہ جس کے پاس پیسہ ہو، اس سے وہ عزت و عظمت کو خرید لیتا ہے۔ اس لئے اس کے

لئے مہنگائی کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ہے۔

مہنگائی سماج کو طبقاتی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ وہ لوگ کہ جن کے پاس عام ذرائع ہوتے ہیں ان کے لئے مہنگائی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ بلکہ مہنگائی ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوتی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ زیادہ سے زیادہ دولت کماتے ہیں۔ دوسری طرف محروم اور مجبور لوگوں کا جم غفیر ہوتا ہے کہ جو مہنگائی کے ہاتھوں اپنی صحت، عزت، شرافت اور ایمانداری کو قربان کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ شہر کے چوراہوں پر عورتوں، بچوں اور مردوں کا جمع غفیر ہوتا ہے کہ جو ہاتھ پھیلائے خیرات کے منتظر ہوتے ہیں۔ ایسے مناظر کسی بھی مہذب معاشرے کے لئے باعث شرم ہوتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں جس تیزی سے مہنگائی ہو رہی ہے۔ اسی تیزی سے فاقہ زدوں اور مفلس لوگوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔

اب کچھ تو بھیک کے ذریعہ اپنی غربت کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو معاشرے سے انتقام لیتے ہیں اور مسلح ہو کر ڈاکو بن جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ اپنا حق گڑگڑا کر نہیں مانگتے ہیں بلکہ پستول کے زور پر زبردستی وصول کرتے ہیں۔ جب یہ صورت حال ہو تو ہم مہنگائی کے ساتھ ساتھ جرائم کے بڑھنے کو بھی ایک المیہ قرار دے دیتے ہیں۔ ہم بھیک مانگنے والوں پر ترس کھاتے ہیں اور نہیں تھوڑا بہت دے کر اپنی فیاضی پر خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر ڈاکوؤں سے ڈرتے ہیں اور ان کی لوٹ پر ماتم کرتے ہیں۔ اور حکومت کو الزام دیتے ہیں کہ وہ انہیں کنٹرول نہیں کر سکی۔ دیکھا جائے تو مہنگائی اور جرائم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس کی ذمہ داری حکومت اور حکمراں طبقوں پر ہے۔

قانون

اخبار کی ایک خبر کے مطابق پنجاب اسمبلی کے ایک رکن نے جب اسمبلی کے سامنے ٹریفک کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی کار لے کر گئے اور ٹریفک وارڈن نے انہیں روک کر بتایا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں تو اسمبلی کے رکن نے انتہائی رعونت سے جواب دیا کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں۔ یہ کہہ کر وہ خلاف ورزی کرتے ہوئے چلے گئے۔

یہ ایک واقعہ نہیں ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ جب سیاستدان منتخب اسمبلی کے اراکین نوکرشاہی کے اعلیٰ عہدے دار اور فوجی افسران مختلف قسم کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کی دلیل ہمیشہ سے یہ ہوتی ہے کہ ان کا عہدہ اور مرتبہ اس قدر اعلیٰ اور اونچا ہے کہ وہ قانون سے بالاتر ہیں۔ لہٰذا قانون عام آدمی کے لئے ہے۔ مراعات یافتہ طبقہ اس سے بالاتر ہے۔

قانون کے بارے میں ہمارے سماج میں یہ تصور عہد وسطیٰ کا ہے یا اس سے بھی پہلے قدیم دور کا کہ جب قوانین میں یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ سزاؤں میں امراء اور اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں کو کیا ملنی چاہئے اور عام لوگوں کے لئے کیا ہونی چاہئے۔ قدیم ہندوستان میں موریہ نے جو قوانین بنائے تھے ان میں اعلیٰ ذات کے لوگوں کو ہلکی سزا دی جاتی تھی جب کہ نچلی ذات کے لوگ سخت سزاؤں کے مستحق ہوتے تھے۔

یورپ میں قتل کی سزا کے طور پر امراء کا سر اڑایا جاتا تھا جب کہ عام لوگوں کو پھانسی کی سزا دی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے فرانسیسی انقلاب میں جب مساوات کا نعرہ لگایا گیا اور سماج سے اعلیٰ و ادنیٰ کی تخصیص ختم کی گئی تو ایک ڈاکٹر کہ جس کا نام گلوٹن تھا، اس نے گلوٹین

ایجاد کی تاکہ امیر وغریب سب کا گلا کاٹ کر انہیں موت کے گھاٹ اتارا جائے۔

موریہ دور لکھی گئی ارتھ شاستر میں بھی اونچی اور نچلی ذات کے لوگوں کے لئے علیٰحدہ علیحدہ سزائیں اور جرمانوں کے بارے میں تفصیل دی گئی ہے۔ مار پیٹ کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ اگر یہی حرکت کسی اونچی ذات والے کے ساتھ کی جائے (یعنی مار پیٹ) تو جرمانہ دگنا ہوگا نچلی ذات یعنی شودر کے لئے کہا گیا کہ کوئی شودر جس ہاتھ پاؤں سے برہمن کو مارے ''وہ کاٹ دیا جائے''۔

سزاؤں کے قوانین میں یہ فرق یورپ وایشیا کے ملکوں میں ایک طویل عرصہ تک رہا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے حکمراں طبقے، امراء اوراونچی ذات کے لوگ عام لوگوں پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس فرق کے ذریعہ لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ اپنی ذات اور مرتبہ کی وجہ سے قانون سے بالاتر ہیں۔ کیونکہ جولوگ قانون ے بالاتر ہوتے تھے۔ سماج میں ان کی عزت زیادہ ہو جاتی تھی۔ جو قانون کی زد اور اس کے دائرے میں ہوتے تھے وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوتے تھے۔ ان میں ڈر اور خوف ہوتا تھا کہ ان کو ذرا سی خلاف ورزی پر سزا ملے گی۔ جب کہ قانون سے بالاتر طبقوں کے لئے یہ اعزاز کی بات تھی کہ وہ اس کے دائرے میں نہیں آتے ہیں۔

لہٰذا قانون کے اس نفاذ کی وجہ سے حاکم ومحکوم کا فرق قائم ہوا۔ مثلاً ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے بھی ہندوستانیوں اور انگریزوں کے لئے علیحدہ قوانین بنائے۔ سزاؤں میں بھی فرق رکھا گیا تاکہ محکوم لوگوں کو یہ احساس ہو کہ ان کا مرتبہ حاکموں کے برابر کا نہیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال ہم نے جنوبی افریقہ میں اپارتھائڈ کے نظام میں دیکھی جس میں کالوں اور گوروں کے درمیان قانونی طور پر فرق رکھا گیا تھا۔ امریکہ میں ایک عرصہ تک قوانین کے ذریعہ کالے لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بسو میں بھی ان کی نشستیں سب سے پیچھے ہوا کرتی تھیں۔ اس طرح قانون کے ذریعہ غیر مساوی سماج کو باقی رکھا گیا۔

لیکن جب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جمہوری نظام آیا جمہوری ادارے

قائم ہوئے تو اس میں سب سے پہلے اس بات پر زور دیا گیا کہ قانون کی بالادستی قائم ہو۔ اور قانون کی نظروں میں سب برابر ہوں، کیونکہ صرف اس صورت میں انصاف ممکن تھا۔ انگلستان میں خاص طور سے مفکرین کا ایک گروہ تھا جو ''افادیت پسند'' کہلاتے تھے انہوں ے قانون کی بالادستی کو سماج کی ترقی اور قوم کی ہم آہنگی کے لئے ضروری قرار دیا۔ ان کے نزدیک نہ صرف انصاف بلکہ مساوات بھی اسی صورت میں قائم ہو سکتی تھی جب کہ قانون کی نظروں میں سب برابر ہوں اور اس میں امیر و غریب اعلیٰ و ادنیٰ کی تخصیص ختم ہو جائے۔

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پاکستان میں کیوں حکمراں طبقے اور عہدہ دار خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں اور قانون کو صرف عام لوگوں کے لئے تصور کرتے ہیں کہ وہ اس کی پابندی بھی کریں اور اس کی خلاف ورزی پر سزا بھی پائیں۔ غیر جمہوری سماجوں میں عزت و عظمت اور رتبہ کا تعین اس پر ہوتا ہے کہ کسی فرد کی پاس کس قدر دولت ہے، جائداد ہے۔ اور اگر وہ عہدے دار ہے تو اس کے پاس کس قدر اختیارات ہیں۔ اس لئے اس کی عزت کا معیار یہ ہوا کرتا ہے۔ اگر وہ ان سے محروم ہے تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور بغیر حیثیت کے فرد کے کوئی حقوق ہی نہیں ہوتے ہیں۔

لہٰذا یہ فرق سماج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے حاکم و محکوم محکوموں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ حاکموں کی فرماں برداری کریں۔ ان کی اطاعت کریں اور ان کے بناء ہوئے قوانین اور ضوابط کی پابندی کریں۔ ایسے معاشروں میں انصاف کا تصور بھی بدل جاتا ہے۔ انصاف کے خواہش مند محکوم طبقے ہوتے ہیں۔ حاکموں کے پاس کہ جو بااختیار اور طاقت ور ہوتے ہیں انہیں انصاف کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

جمہوری معاشروں میں لوگوں کے مرتبہ اور ان کی عزت کا تعین ان کی لیاقت، صلاحیت اور ان کے پیشہ ورانہ کاموں سے ہوتا ہے۔ اس صورت میں معاشرے کے تمام لوگ شہری ہوتے ہیں اور ہر شہری قانون کی نظر میں برابر ہوتا ہے۔ جب وہ انصاف کا طلب گار ہوتا ہے تو اسے یہ انصاف ملتا ہے کیونکہ قانون کی بالادستی ہوتی ہے اس کے آگے افراد کی دولت، جائداد، اور خاندانی شہرت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔ جب قانون کی نظروں میں سب برابر ہو جائیں، اور قانون تمام لوگوں پر یکساں طور پر لاگو ہو تو اس صورت میں

معاشرے میں نظم وضبط آتا ہے اور طاقت ور لوگوں کو یہ حق نہیں ملتا ہے کہ ہو کمزوروں کا استحصال کریں۔

اس صورت حال کی روشنی میں اگر پاکستان کے معاشرہ کو دیکھا جائے تو یہ اب تک عہد وسطیٰ کے زمانہ میں ہے کہ جہاں حکمران اور رعیت کا تصور تھا۔ اس جمہوری دور میں بھی طبقہ اعلیٰ کے لوگ خود کو حکمران سمجھتے ہیں، شہری نہیں۔ اس لئے وہ اپنا حق سمجھتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی کریں۔ کیونکہ اس خلاف ورزی کی صورت میں وہ عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور اس صورت میں لوگوں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ وہ قانون سے بالاتر ہیں اس لئے ان کی عزت و احترام کرنا چاہئے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن میں لیاقت، صلاحیت اور ذہانت نہیں ہے۔ یہ دولت، جائداد اور حکومتی اختیارات کی بنا پر خود کو عام لوگوں سے جدا کرتے ہیں۔

جب یہ صورت حال ہو اور قانون کی عزت نہ رہے تو اس صورت میں معاشرہ لاقانونیت، انتشار اور پراگندگی کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ ہمارا معاشرہ ہے۔

جلاوطنی کی سیاست

ایک وقت میں فرد اور برادری کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا تھا، اس وجہ سے وہ اس پر مجبور تھا کہ برادری کے رسم و رواج اور پابندیوں کو تسلیم کرے، اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا تھا، تو اسے ذات برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب اسے برادری کی حمایت اور تحفظ حاصل نہیں ہے، اور وہ اکیلا ہے۔ اس صورت میں یا تو وہ علاقہ چھوڑ کر چلا جاتا تھا، یا برادری کی شرطیں مان لیتا تھا۔

جب آگے چل کر ریاست کا ادارہ وجود میں آیا اور ریاست پر حکمرانی کے لئے ایک طبقہ بطور حکمران بنا تو اب یہ دستور ہوا کہ جو فرد ریاست یا حکومت کی مخالف کرے گا، یا ان کے قائم کئے ہوئے نظام سے بغاوت کرے گا تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ اب یہ سزا مختلف وقتوں میں کئی قسم کی تھی۔ یعنی سیاسی مخالفوں کو یا تو قید کر دیا جاتا تھا، یا قتل کر دیا جاتا تھا، یا انہیں جلاوطن کر دیا جاتا تھا۔ ان تینوں سزاؤں کا مقصد یہ تھا کہ اس شخص کے خیالات و افکار اور عملی سرگرمیوں سے ریاست، حکومت اور سماج کو محفوظ رکھا جائے۔

چنانچہ قدیم یونان میں یہ دستور تھا کہ بدعنوان سیاستدانوں کو دس سال کے لئے جلاوطن کر دیا جاتا تھا، ان کا خیال تھا کہ دس سال کے عرصہ میں یا تو اس کا اثر و رسوخ ختم ہو جائے گا یا وہ اپنے خیالات کو بدل لے گا۔ جلاوطنی کی سزا قید اور قتل سے زیادہ اچھی تھی، کیونکہ اس صورت میں قید میں رکھ کر نہ تو نگرانی کا سوال پیدا ہوتا تھا، اور نہ ہی قتل کر کے لوگوں میں اشتعال پھیلنے کا خطرہ تھا۔

قدیم رومیوں نے بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا۔ روم کے شہنشاہ آگسٹس کے زمانے میں اس نے اپنی بیٹی جولیا کو اس لئے جلاوطن کیا کہ وہ اس کے بے راہ روی سے تنگ

آ گیا تھا، اور بحیثیت شہنشاہ کے وہ اس کے لئے شرمندگی کا باعث بن رہی تھی۔ لہٰذا اسے جلاوطن کر کے اس نے رومی سماج کی اقدار کو تحفظ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے عہد کے مشہور شاعر اووڈ (Ovid) کو بھی جلاوطن کر دیا، کیونکہ اس کی شاعری میں جن جنسی جذبات کا اظہار کیا جا رہا تھا، وہ رومی سماج کے قدامت پرست لوگوں کو ناپسند تھے۔

آگسٹس کے جانشینوں نے روم کے مشہور فلسفی سینیکا (Senica) کو بھی جلاوطن کر دیا تھا، کیونکہ حکمراں طبقے اس کے خیالات سے متفق نہیں تھے۔ اگرچہ بعد میں اس کے شاگرد نیرو (Nero) نے اسے واپس بلا لیا تھا۔

مسلمانوں کے زمانے میں بھی اس سزا پر عمل ہوتا رہا۔ مثلاً حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابوذر غفاریؓ کو اس وجہ سے دور ریگستانی علاقے میں جلاوطن کر دیا تھا کیونکہ وہ امراء اور دولت مندوں پر تنقید کرتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ موجودہ دور میں بھی، ہر ملک میں جاری ہے۔ مثلاً مشہور جرمن فلسفی کارل مارکس کو جرمنی، فرانس اور بلجیئم سے جلاوطن کیا گیا، تو اس نے بالآخر برطانیہ میں پناہ لی اور وہیں رہ کر اپنا تحقیقی کام کیا، اور وہیں اس نے وفات پائی۔

لہٰذا جلاوطنی کی ایک قسم تو وہ ہوتی ہے کہ جس میں ریاست، یا حکومت کسی شخص کو زبردستی ملک سے نکال دیتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہوتی ہے کہ جس میں افراد اپنی جان کے خوف سے، یا اس خیال سے کہ وہ اپنے ملک کے ماحول میں رہتے ہوئے خیالات کا اظہار نہیں کر سکیں گے، اس لئے یہ افراد رضا کارانہ طور پر جلاوطنی اختیار کر لیتے ہیں۔ خاص طور سے یہ صورت حال ان ملکوں میں پیش آتی ہے کہ جہاں آمرانہ طرزِ حکومت ہو، لوگوں پر پابندیاں ہوں، اس صورت میں سیاستداں، ادیب و شاعر و فلسفی خاموشی سے دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں کہ جہاں آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ مثلاً جرمنی میں جب ہٹلر اور نازی پارٹی اقتدار میں آئی، اور انہوں نے اپنے خاص نسلی اور آمرانہ نظریہ کا نفاذ کیا تو اس وجہ سے شاعر و ادیب، سائنسداں، اور فلسفی بڑی تعداد میں جرمنی چھوڑ کر یورپ کے دوسرے ملکوں میں چلے گئے، یا امریکہ میں جا کر آباد ہو گئے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی یونیورسٹیاں علم و دانش سے ویران ہو گئیں۔ ٹامس من، بریخت، آئن اسٹائن اور مشہور فلسفی اوڈونو، یہ سب امریکہ چلے گئے۔ جب دوسری

جنگ عظیم ختم ہوئی تو ان میں سے کچھ واپس آئے، مگر کچھ وہیں رہے۔ بریخت کو اتحادیوں نے مغربی جرمنی نہیں آنے دیا، اس لئے وہ مشرقی جرمنی میں جا کر آباد ہوا۔

یہ صورت حال روس اور اس کے اتحادی ملکوں میں بھی رہی کہ وہ ان کے نظام سے تنگ آ کر بڑی تعداد میں اوّل زار کے زمانے میں جلاوطنی پر مجبور ہوئے، جن میں لینن بھی شامل تھا۔ لیکن بعد میں کمیونسٹ حکومتوں کے عہد میں بھی جلاوطنی کا سلسلہ جاری رہا۔ روسی انقلاب کے بعد گورکی کو فن لینڈ جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ آگے چل کر ایک بڑی تعداد دانشوروں اور سیاستدانوں کی جلاوطنی پر مجبور ہوئی، ان میں ٹراٹسکی بھی شامل تھا، جسے بعد میں میکسیکو میں اسٹالن کے ایماء پر قتل کر دیا گیا۔

اس لئے موجودہ دور میں سیاسی پناہ کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس کے پس منظر میں ایسے افراد اور لوگوں کو پناہ دینے کا تصور ہے کہ جو اپنے ملک میں خطرے میں ہوں، لیکن جیسا ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلہ کو غلط طریقے سے استعمال کر کے، ان لوگوں کے لئے مشکلات پیدا کر دی ہیں کہ جو واقعی سیاسی پناہ چاہتے ہیں، اور جنہیں اپنی جان کا تحفظ چاہیئے، اور اپنے خیالات کی آزادی کے مواقع ملنے چاہئیں۔

ریاست اور تعلیم

جدید دور میں جب ریاست نے تعلیم کو اپنے ذمہ لیا تو اس نے اس کے ذریعہ لوگوں کے ذہن پر تسلط کرنا شروع کیا۔ مثلاً کولونیل دور میں جب برطانوی حکومت نے ہندوستان میں انگریزی کو سرکاری زبان بنایا تو اس کی وجہ سے دوسری ہندوستانی زبانوں کی ترقی رک گئی، کیونکہ اب ریاستی ملازمتوں کے لئے انگریزی کا جاننا ضروری ہوگیا، اس لئے ایک تعلیم یافتہ شخص کی پہچان یہ ہوئی کہ وہ اس کا ماہر ہو۔ اس کی وجہ سے پرانی نسل کے لوگ کہ جو عربی و فارسی اور سنسکرت یا دوسری زبانیں جانتے تھے وہ تعلیم یافتہ نہیں رہے۔ اس نے ان زبانوں کے علمی و ادبی خزانے کو بھی بے وقعت بنا دیا۔

کولونیل حکومت نے ہندوستان کے لوگوں پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لئے یہاں انگریزی ادب اور تاریخ کے مضامین پڑھانا شروع کئے تاکہ جدید تعلیم یافتہ لوگ ذہنی طور پر ان سے متاثر ہوکر، کولونیل حکومت اور انگریزوں کی برتری کو تسلیم کرلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب تک پرانی تعلیم میں لوگ رومی، حافظ، جامی، فردوسی، امیر خسرو اور سوری کو پڑھتے تھے کہ جن کی شاعری پڑھنے کے بعد دنیا کے بارے میں ایک نقطۂ نظر پیدا ہوتا تھا، اور سماج اور اس کے اخلاق کے تصورات تشکیل پاتے تھے۔ لیکن جب ان کی جگہ شیکسپیئر، ملٹن، شیلے، بائرن، ورڈز ورتھ اور کیٹس پڑھا جانے لگا تو اس نے بالکل ہی ایک نیا نقطۂ نظر دیا کہ جس سے جدید تعلیم یافتہ دنیا کو دیکھنے لگا، اور بالآخر یہی ان کے ذہنوں پر غالب آیا۔

یہی صورت حال تاریخ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہوئی کہ جس میں بتایا گیا کہ انگلستان کے ایک چھوٹے سے ملک نے کس طرح اپنی جرأت، ہمت، بہادری، ایمانداری اور اعلیٰ مقاصد کے تحت دنیا پر فتح پالی اور ایک عظیم ملک بن گیا، یعنی ایک چھوٹے سے ملک

نے کس طرح ہندوستان جیسے برصغیر پر اس لئے قبضہ کیا کہ اہل ہندوستانی بدعنوان، جاہل، سست وکاہل تھے اور ان کے حکمراں ظالم و جابر۔ اس میں انگریزوں کے ان افراد کی تعریف و توصیف کی گئی تھی کہ جنہوں نے ہندوستان میں ان کے راج کو مضبوط و مستحکم کیا تھا، جیسے کلائیو، وارن ہسٹنگز، ڈلہوزی اور کیننگ وغیرہ۔

تعلیم کا یہ نقطہء نظر اس وقت یکدم تبدیل ہو گیا کہ جب ہندوستان آزاد ہوا، اور تقسیم کے نتیجہ میں دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس نے انگریز دور کی برکتوں کو ہندوستان کے لئے مصیبتوں کا باعث بتایا، اب برطانوی ہیروز کی جگہ وہ افراد آ گئے کہ جنہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا، اور جو انگریزوں کی نظر میں مفسد اور جھگڑالو تھے۔ آزادی نے برصغیر کی تاریخ کو الٹ دیا۔ بھگت سنگھ، دہشت گرد سے آزادی کا ہیرو ہو گیا، ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں تاریخ کو نئے سرے سے لکھا گیا، جس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے کردار کو ابھارا گیا۔

پاکستان میں نصاب تعلیم حکومتوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی اس وقت آئی جب ایوب خاں نے مارشل لاء لگایا۔ اس کے ساتھ ہی جمہوریت اور عوامی رائے کی اہمیت ختم ہو گئی، فوج کے کردار کو بڑھاوا ملا۔ تعلیم میں سماجی علوم کی جگہ، سائنس کو ترجیح دی گئی۔ کیونکہ سماجی علوم کہ جن میں تاریخ، فلسفہ، سوشیالوجی اور سیاسیات ہوتے ہیں، وہ لوگوں کے ذہنوں میں سوالات پیدا کرتے ہیں۔ ان سوالات سے نئے خیالات و افکار آتے ہیں۔ اس لئے ان کی جگہ سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت ہوئی، جس میں سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت کم ہوتی ہے۔ تاریخ کے مضمون کو اسکولوں سے ختم کر دیا گیا، اور اس کی جگہ معاشرتی علوم پڑھائے گئے۔ جس میں شہریوں پر زور دیا گیا کہ وہ حکومت کی اطاعت کریں، اور ملک و قوم کے وفادار رہیں۔

زیڈ۔ اے۔ بھٹو کی حکومت میں مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کے مضامین شروع ہوئے، تاکہ نوجوانوں کو اچھا پاکستانی اور مسلمان بنایا جائے۔ اس کے بعد نصاب تعلیم میں اہم تبدیلیاں اس وقت آئیں جب ضیاء الحق کا مارشل لاء لگا، اب ہر مضمون کو اسلامی بنانے کا عمل شروع ہوا، جس کی وجہ سے تعلیم کا معیار گرتا چلا گیا۔

لہٰذا ریاست نے جب تعلیم کو اپنی سرپرستی میں لیا، تو اس کے ذریعہ حکمراں طبقوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے اس عمل اور پالیسی سے نوجوانوں کے ذہنوں میں تنگ نظری آئے گی، وہ دنیا میں ہونے والے واقعات اور تبدیلیوں سے بے خبر رہیں گے۔ انہیں کبھی مذہبی جذبات اور کبھی وطن پرستی وحب الوطنی کے احساسات کے ذریعہ اپنے تابع و ماتحت رکھا۔

اس عرصہ میں ہم پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ ایک طرف ریاست تعلیم کے ذریعہ خود کو مضبوط کر رہی ہے تو دوسری طرف نجی ادارے تعلیم کو صنعت بنا کر پیسہ بنا رہے ہیں۔ اس پورے عمل میں سماج کو باشعور بنانے کا ان میں سے کسی کا نہ تو منصوبہ ہے اور نہ ہی یہ ان کے مفاد میں ہے۔ تعلیم کو جب تک ان سے چھٹکارا نہیں دلایا جائے گا، ہم تخلیقی ذہن پیدا نہیں کر سکیں گے۔

اتھارٹی اور روایات

کسی بھی کلچر میں دو چیزوں کی اہمیت ہوتی ہے، ایک اتھارٹی اور دوسری روایت۔ اس لئے جب بھی سماج میں تبدیلی کی بات ہو، اور جدیدیت کے عمل کو فروغ دینا ہو، تو اس کے مقابلہ میں یہ دونوں چیزیں لائی جاتی ہیں کیونکہ ان کی بنیاد پر سماج کو تسلسل کے ساتھ ایک ہی شکل میں رکھا جاتا ہے، اس وجہ سے قدیم و جدید روایات کے تصادم میں ایک جانب قدامت پرست اور تسلسل کی قوتیں ہوتی ہیں جو کہ تبدیلی کے خلاف ہوتی ہیں اور سوسائٹی کو ایک سی حالت میں رکھنا چاہتی ہیں، جب کہ ان کے مقابلہ میں جدید قوتیں مستقبل کے بارے میں سوچتی ہیں، اور تبدیلی کے ذریعہ آگے کی جانب جانا چاہتی ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتھارٹی اور روایت میں اس قدر قوت کیوں ہوتی ہے کہ وہ تبدیلی کے عمل کی مخالفت کرتی ہیں، اور مشکل سے شکست تسلیم کرتی ہیں۔ اتھارٹی کئی قسم کی ہوتی ہے، مذہبی اتھارٹی میں جب مذہبی اداروں یا کتابوں کا حوالہ دیا جاتا ہے تو اس پر تنقید کرنا یا اسے رد کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو جاتا ہے جس میں اتھارٹی کو بغیر کسی استدلال کے تسلیم کر لیا جاتا ہے، دوسری قسم کی اتھارٹی شخصی ہوتی ہے جس میں کسی فلسفی یا مفکر کے افکار و خیالات کو اس کے علم اور تجربات کی روشنی میں درست تسلیم کر لیا جاتا ہے، اور یہ خیال کر لیا جاتا ہے کہ کوئی اور اب اس پایہ کا نہیں کہ جو اس کو تبدیل کر سکے یا اسے ختم کر سکے۔ اس وجہ سے ایک عرصہ تک علمی دنیا میں ارسطو کے افکار و خیالات کا غلبہ رہا۔ سیکولر اتھارٹی وہ ہوتی ہے کہ جس کی بنیاد انسانی تجربات پر ہوتی ہے، اس لئے ان تجربات و مشاہدات کی بنیاد پر یہ اپنا اثر قائم کرتی ہے۔ سائنسی اتھارٹی ان تجربات پر مبنی ہوتی ہے جو کہ لیبارٹری میں کئے جاتے ہیں۔

اتھارٹی کو چیلنج کیا جاتا رہا ہے، مگر بعض اتنی طاقتور اور گہری ہوتی ہیں کہ ان کے اثر و رسوخ کو ختم کرنا مشکل ہوتا ہے، عام طور سے سوسائٹی میں اتھارٹی کو صحیح اور درست تسلیم کرنے پر اس لئے زور دیا جاتا ہے کیونکہ ہر فرد کا اتنا علم اور تجربہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ سوسائٹی کے ہر پہلو اور شعبہ کو سمجھ سکے، اس لئے جس طرح سے وہ ڈاکٹر کی اتھارٹی کو مان لیتا ہے، کیونکہ اسے علم طب کے بارے میں پتہ نہیں ہوتا ہے، اسی طرح وہ انجینئر، اور آرکیٹیکٹ کی اتھارٹی کو بھی تسلیم کر لیتا ہے۔

لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ تاریخ میں تبدیلی اسی وقت آتی ہے جب اتھارٹی کو چیلنج کیا جائے۔ اگر ایسے نہیں ہوتا تو علم طب میں آج ترقی کرنے کے بجائے قدیم حکماء یعنی بقراط، جالینوس اور ابن سینا کو مانتے ہوتے اور بیماریوں کے بارے میں نئی دوائیں دریافت نہیں ہوتیں۔ یہی صورت سائنس میں ہوتی کہ جہاں ٹالمی کے نظریہ پر قائم رہتے کہ دنیا ساکت ہے اور سورج گردش کر رہا ہے۔ یا سیاسی و سماجی و معاشی معاملات میں اگر اتھارٹی کو رد نہیں کیا جاتا تو ہمارا سیاسی و معاشی نظام ہمارے مسائل حل کرنے میں ناکام ہو جاتا۔ اس وجہ سے اتھارٹی کو چیلنج کرنا اور نئے افکار و خیالات کو پیدا کرنا سوسائٹی کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

تبدیلی کی راہ میں دوسری رکاوٹ روایات ہوتی ہیں۔ سوسائٹی میں اس لئے روایات کا احترام ہوتا ہے کیونکہ یہ نسل بعد نسل ایک تسلسل کے ساتھ آتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کے پس منظر میں تاریخی سرمایہ ہوتا ہے جو انہیں درست یا صحیح ہونے کا جواز دیتا ہے۔ روایات کا نفاذ معاشرے میں رضا کارانہ ہوتا ہے، انہیں کسی قانون کے تحت نافذ نہیں کیا جاتا ہے، بلکہ ان کی پابندی لوگ سماج کے ڈر اور خوف سے کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ روایات خاص وقت میں خاص ضرورت کے تحت پیدا ہوتی ہیں، چونکہ سوسائٹی بدلتی رہتی ہے، اس لئے ضرورت کے تحت نئی روایات کو پیدا ہوتے رہنا چاہئے، لیکن اگر جدید زمانے میں قبائلی اور جاگیردارانہ روایات کو برقرار رکھا جائے گا تو یہ جدید ذہن سے ٹکراؤ پیدا کرے گا۔ پاکستان اس وقت اس صورت حال سے دوچار ہے، ایک طرف قبائلی روایات ہیں کہ جن پر فخر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، اور انہیں اپنی شناخت

کے طور پر مانا جاتا ہے، مگر دوسری طرف جدید دنیا اور بدلتے حالات ہیں، اس لئے اگر سوسائٹی فرسودہ روایات کو باقی رکھنا چاہے گی، تو یہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوگی، جیسے کاروکاری، عزت کے نام پر قتل، ونی، اور قرآن سے شادی کی روایات۔

کچھ روایات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کے مثبت اثرات ہوتے ہیں، مثلاً مہمان نوازی، شائستگی، خوش خلقی، اور رواداری۔ اگر ان روایات کو باقی رکھا جائے تو یقیناً یہ سوسائٹی کے لئے مفید ہوں گی، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے، اس وجہ سے یورپ میں افادیت پرستی کا نظریہ ابھرا تھا، جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ایسی تمام روایات اور ادارے جو کہ اپنی افادیت کھو چکے ہیں، اور فرسودہ ہو گئے ہیں، انہیں ختم کر دینا چاہئے اور ان کی جگہ وقت کے تقاضوں کے تحت نئی روایات اور ادارے بنانا چاہئیں۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال میں ہمارے لئے یہ سوال بہت اہم ہے کہ کیا ہم قدامت پرستی کو برقرار رکھتے ہوئے اتھارٹی، اور فرسودہ روایات کے تسلسل کو جاری رکھیں، یا تبدیل ہوتی دنیا کے ساتھ خود کو اور اپنی سوسائٹی کو بھی تبدیل کریں، کیونکہ قدامت پرستی کا تعلق ماضی سے ہے، جب کہ تبدیلی کا تعلق مستقبل سے ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ کیا ہمیں ماضی چاہئے یا مستقبل؟

علم کی طاقت

علم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ اسی وجہ سے اس کو دوسروں پر حکومت کرنے اور انہیں اپنے زیر اثر لانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ تہذیب کے ابتدائی دور میں علم کا تعلق مذہب سے تھا، اس میں دیوی و دیوتاؤں کو خوش رکھنے کے لئے دعائیں اور بھجن تھے، اس لئے پجاریوں کا اس علم پر کنٹرول تھا، وہ دوسروں کو اس کے سیکھنے سے باز رکھتے تھے، اسی وجہ سے ہندوستان میں برہمنوں نے، اپنے قوانین میں یہ لکھوالیا تھا کہ اگر کسی شودر کے کانوں میں وید کے بول پڑ جائیں تو ان میں پگھلا ہوا سیسہ بطور سزا ڈالا جائے۔ چونکہ اس ابتدائی علم کا تعلق مذہب سے تھا اس لئے لوگ اس سے ڈرتے تھے اور پجاریوں اور برہمنوں کی اس لئے عزت کرتے تھے کہ ان کا رابطہ دیوی و دیوتاؤں سے ہے۔

تہذیب کے دوسرے دور میں جب زبانیں لکھی جانے لگیں، تو ریاست کو اپنے لئے حساب کتاب کی ضرورت ہوئی، اس مقصد کے لئے دفتری لوگوں کا طبقہ وجود میں آیا، جو بادشاہ کے احکامات، قوانین، اور ٹیکسوں کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرتے تھے۔ اب علم پر انتظامیہ کا بھی کنٹرول ہو گیا۔ اس نے مندروں کے ساتھ ساتھ ریاست کے ادارے کو مضبوط کیا۔

رسم الخط کی ایجاد نے تاجروں کو بھی اس طرف مائل کیا کہ وہ اپنے تجارتی حساب کتاب اور معاہدوں کے لئے اہل علم کی خدمات حاصل کریں۔

علم کی اس اجارہ داری کی وجہ سے عام لوگ اہل علم سے خوف زدہ رہتے تھے، کیونکہ جن لوگوں کے پاس یہ علم تھا، وہ اس کے ذریعہ لوگوں کا استحصال کرتے تھے۔

ہندوستان میں ساہوکار اور بنئے کسانوں کو سود پر رقم دے کر، اپنے ہی کھاتوں میں حساب رکھتے تھے کہ جن سے وہ زندگی بھر نجات نہیں پاتے تھے۔ اسی وجہ سے بھگت کبیر، جو بھگتی تحریک کے ایک اہم راہنما تھے انہوں نے اس کتابی علم پر سخت تنقید کی ہے، کیونکہ یہ علم لوگوں پر ظلم ڈھاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ اس علم کو ترجیح دیتے ہیں کہ جس کی بنیاد انسانی تجربات اور مشاہدات پر ہے۔ ان کی اس تعریف سے علم کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری میں نہیں رہتا ہے، بلکہ ہر شخص اس کا دعویدار ہو جاتا ہے۔

عہد وسطیٰ کے آتے آتے علم محدود ہی رکھا گیا۔ مسلم دنیا میں مدرسوں پر علماء کا قبضہ تھا، تو مغرب میں تعلیمی ادارے چرچ کے پاس تھے۔ اس لئے تعلیم پر مذہب کا زیادہ اثر تھا۔ سیکولر علوم کے لئے کوئی ادارے نہ تھے۔ جب فرانسیسی انقلاب (1789) کے بعد ریاست نے تعلیم کو سنبھالا، تو اب چرچ و علماء کے بعد ریاست نے تعلیم کا اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یورپ اور ایشیا و افریقہ میں جب قومی ریاستوں کا وجود عمل میں آیا تو جہاں اور چیزیں قومی ہوئیں، وہاں تعلیم بھی قومی ہو گئی۔

قومی ریاستوں میں خاص طور سے نصاب کی کتابوں پر توجہ دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ نوجوانوں میں ملک و قوم اور حکمرانوں کی محبت اور وفاداری کے جذبات پیدا کئے جائیں، اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے علم کو مسخ کیا جاتا ہے اور طالب علموں کو اسی قدر بتایا جاتا ہے کہ جس سے ریاست کے مفادات پورے ہوں۔

تاریخ میں طاقت ور اور حکمراں طبقوں نے علم پر اس لئے تسلط قائم کیا، کیونکہ انہیں یہ ڈر اور خوف تھا کہ اگر لوگوں کے پاس علم آ گیا تو اس سے ان میں شعور و آگہی پیدا ہو گی، وہ یہ سمجھ پائیں گے کہ حکمرانوں کا یہ نظام کوئی الٰہی یا قانونی نہیں ہے اور نہ ہی یہ فطری ہے، بلکہ اسے انہوں نے اپنے مفادات کے لئے بنایا ہے۔

علم کی طاقت کا یہی ڈر تھا کہ امریکہ میں غلاموں کے لئے قانوناً تعلیم ممنوع قرار دیدی تھی، اگر کوئی اسے خفیہ طریقہ سے حاصل کرتا تھا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔ اسی طرح عورتوں کے لئے تعلیم پر پابندی تھی مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی نے بہشتی زیور میں لکھا کہ اگر انہیں پڑھایا جائے تو صرف اس قدر کہ یہ دھوبی کا حساب کتاب رکھ سکیں، اس سے

زیادہ نہیں۔ پاکستان کے سرحدی علاقوں میں بھی عورتوں کی تعلیم کی سخت مخالفت ہے، اور ان کے اسکول بند کرا دیئے ہیں۔ تعلیم کی یہ پابندی محکوم طبقوں کے لئے اس لئے ہوتی ہے تا کہ انہیں اپنی حیثیت کا اندازہ نہ ہو، اور وہ اپنی حالت پر مطمئن رہیں۔

لہٰذا اگر حکمراں طبقے علم کے ذریعہ اپنے تسلط کو قائم رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں وہ ایسے دانشوروں اور مفکروں کی خدمات حاصل کر لیتے ہیں کہ جو مالی منفعت کے لئے اپنی تخلیقات کے ذریعہ ان کے نظام کو جائز قرار دیتے ہیں، اور ان کے مفادات کو درست ثابت کرتے ہیں تو دوسری طرف اب عام لوگ بھی علم کے ذریعہ ان سے مزاحمت کرتے ہیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر ظلم و استحصال اور جابرانہ حکومتوں کے خلاف دانشور اور مفکرین کا ایک طبقہ ہوتا ہے، جو ان سے مقابلہ کرتا ہے اور عوام کو باشعور بناتا ہے۔ یہی افکار و خیالات ہوتے ہیں کہ جو سماج کو بدلتے ہیں، انقلابات کو پیدا کرتے ہیں، اور لوگوں کو جبر و تشدد سے آزاد کراتے ہیں، درحقیقت علم کا یہ استعمال ہے کہ جو عوام کو طاقت دیتا ہے، اور یہی علم ہے کہ جو زندہ رہتا ہے۔

قومی لباس

ہر سماج میں لباس کی اہمیت ہوتی ہے اس سے کسی فرد کی مذہبی، سماجی اور قومی شناخت ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی لباس کے ذریعہ کسی کے سماجی رتبہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر سماج میں لباس کے بارے میں ہدایات ہوتی ہیں کہ کس قسم کا پہننا چاہیے، اور کس کو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ جو سماج کی ان روایات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، انہیں ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن لباس کے سلسلہ میں لوگوں کے رویے بدلتے رہتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ فیشن بھی بدلتے ہیں۔ لوگوں کی پسند اور ناپسند میں تبدیلی آتی ہے اور سماجی و مذہبی پابندیوں کے باوجود لوگ نئے طرز کے لباس پہننا شروع کر دیتے ہیں۔

جہاں لباس کا تعلق سماج کے طبقوں، موسم اور لوگوں کے مذاق سے ہوتا ہے وہاں اب قومی لباس کا تصور جڑ پکڑ گیا ہے۔ اس تصور کا تعلق اس قومی جدوجہد سے ہے جو کہ خاص طور سے بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف شروع ہوئی تھی۔ اس قومی جدوجہد نے جہاں قوم پرستی کے تحت لوگوں میں کولونیل ازم کے خلاف جذبات پیدا کئے وہیں مغربی لباس کے خلاف ردعمل کے طور پر قومی لباس کا تصور ابھرا۔ اس جذبہ کے پس منظر میں برطانوی اقتدار کا قائم ہونا اور ان کے کلچر کا آنا شامل ہے۔

مثلاً جب ابتدائی دور میں یورپی تاجر ہندوستان میں آئے تو وہ مغربی لباس پہنتے تھے ان کا یہ لباس ہندوستانیوں کے لئے حیرانی کا باعث تھا۔ کہ گرم موسم میں وہ اس قدر چست لباس پہنتے تھے لیکن جب اٹھارویں صدی میں ان میں سے کچھ یورپی ہندوستان میں بس گئے اور یہاں شادیاں کرلیں تو انہوں نے جہاں ہندوستانی معاشرت اختیار کی وہاں ہندوستانی لباس کو بھی اختیار کرلیا۔

ان کے رویہ میں اس وقت تبدیلی آئی کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کرلیا اس مرحلہ پر ان کے لئے یہ لازمی ہو گیا کہ وہ اپنے اور ہندوستانیوں کے درمیان فرق کو قائم رکھیں۔لہٰذا اور باتوں کے علاوہ انہوں نے ہندوستانی لباس ترک کر کے یورپی لباس اختیار کرلیا۔تا کہ ان کی ہندوستانیوں سے مشابہت نہ رہے۔

جب انگریز ہندوستان کے حکمران طبقہ بن گئے تو ان کی تہذیب اور کلچر کا اثر ہندوستانیوں پر بھی پڑا۔ انیسویں صدی میں خاص طور سے وہ لوگ کہ جنہوں نے مشنری اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی، اور انگریزی زبان پر عبور حاصل کیا تھا، وہ ذہنی اور جسمانی طور پر ان کے کلچر سے بھی متاثر ہوئے۔اگر چہ یہ لوگ برطانوی حکومت کے دفتروں میں کام کرتے تھے، انگریزی بولتے تھے، مگر ابھی تک وہ انگریزوں یا مغربی لباس کو اختیار کرتے ہوئے جھجکتے تھے۔سب سے پہلے یورپی تعلیم یافتہ بنگالی طبقہ نے آہستہ آہستہ یورپی لباس کو پہننے کی ابتداء کی لیکن ان کا یہ لباس دفتر جانے اور وہاں سے آنے تک محدود تھا۔جیسے ہی وہ گھر آتے ،اسے اتار کر اپنا روایتی لباس پہن لیتے تھے۔

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق تھا، ان میں یہ مباحثہ ہو رہا تھا کہ مغربی طرز کے لباس کو پہننا چاہیے یا نہیں؟ کیا یہ شریعت کے خلاف ہے یا اس کی اجازت ہے؟ لہٰذا اس مسئلہ پر علماء سے فتاویٰ لئے گئے کہ وہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی راہنمائی کریں۔اس پر علماء کی اکثریت کا یہ فصلہ تھا کہ مغربی لباس کا تعلق چونکہ عیسائیت سے ہے اس لئے اس کا استعمال منع ہے۔

اس کے مقابلہ میں سرسید احمد خان نے اپنی تحریروں کے ذریعہ دلائل دیئے کہ لباس کا تعلق کسی مذہب سے نہیں ہوتا ہے اس لئے اسے خلاف اسلام کہنا درست نہیں ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مغربی لوگوں کی نگاہ میں ہمارا لباس بھدا اور بدنما ہے۔اس لیے وقت کی ضرورت ہے کہ ہم اس لباس کو تبدیل کر کے یورپی لباس اختیار کریں جو کہ ترقی کی علامت ہے۔سرسید کی نسل کے جن لوگوں نے یورپی لباس پہننا شروع کیا انہوں نے یہ اہتمام ضرور کیا کہ اس کے ساتھ ترکی ٹوپی اوڑھتے تھے، تا کہ اس کے ذریعے وہ اپنی مسلم شناخت کا اظہار کرسکیں۔

علی گڑھ کالج (بعد میں یونیورسٹی) کے طالب علموں کا یونیفارم شیروانی اور علی گڑھ کٹ پاجامہ تھا، جو کہ انہیں دوسرے طلباء سے ممتاز کرتا تھا۔

بیسویں صدی کے آتے آتے ہندوستان میں مغربی تعلیم یافتہ طبقے نے یورپی لباس، سوٹ، ٹائی کا استعمال شروع کر دیا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے یورپی کلچر کو بھی اپنا لیا۔ لیکن ابھی تک عورتوں نے اپنے روایتی لباس کو نہیں چھوڑا۔ دیہات کے رہنے والے، اور قصبات کے باشندوں نے بھی غیر ملکی لباس کو نہیں اپنایا۔ یہ شہر میں محدود رہا، اور وہ بھی تعلیم یافتہ اور سرکاری ملازموں کے طبقے میں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سرکاری تقریبات میں جیسے کہ بادشاہ یا ملکہ کی تاجپوشی کا جشن ہو۔ اس میں برطانوی حکومت اس بات کی حوصلہ افزائی کرتی تھی کہ ریاستوں کے راجا اور نوابین اپنے ریاستی اور شاہانہ لباس میں آئیں تاکہ اس سے یہ ثابت کیا جائے کہ برطانوی حکومت کی اس قدر طاقت وقوت اور استحکام ہے کہ والیان ریاست اپنے زرق برق اور سونے چاندی سے کڑھے ہوئے ملبوسات میں باادب سر جھکائے کھڑے ہوتے تھے۔ جب کہ وائسرائے اور انگریز عہدے دار یورپی لباسوں میں موجود ہوتے تھے۔ اس سے حکمرانوں اور رعیت کے درمیان فرق کا اظہار ہوتا تھا۔

یورپی لباس کے خلاف تحریک کا آغاز 1905 میں تقسیم بنگال کے بعد سے ہوا۔ بنگالی قوم پرستوں نے انگریزی لباس کا بائیکاٹ شروع کیا۔ اور اس پر زور دیا کہ لوگ قومی لباس کا استعمال کریں۔ یہ سودیشی تحریک تھی۔ جو کہ پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ 8 اکتوبر 1905ء کو پونا میں لوگوں نے مغربی ملبوسات کو آگ میں جلا کر جشن منایا۔ اس تحریک کے ذریعہ لوگوں کو اس پر تیار کیا گیا کہ وہ نہ صرف مغربی لباس چھوڑ دیں، بلکہ انگلستان کا بنا ہوا کپڑا بھی استعمال نہ کریں۔ چنانچہ اس کے نتیجہ میں لوگوں میں کھدر اور ہندوستان کپڑے کے استعمال کو رواج ہوا۔ اور بہت جلد اس نے مقبولیت حاصل کر لی۔ آگے چل کر کھدر کے لباس کو گاندھی جی نے مقبول بنایا اور کانگرس کے تمام اراکین نے قومیت کے احساس کے ساتھ کھدر کا لباس پہننا شروع کر دیا۔

لباس کی تبدیلی نے کانگرس پارٹی کے کردار کو بھی بدل ڈالا۔ اب تک اس کے

راہنما سوٹ اور ٹائی میں نظر آتے تھے۔ مگر اب یہ منظر نظروں سے غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک نئی پارٹی وجود میں آئی کہ جس کے لیڈر اور ورکر کھدر کے لباس اور گاندھی کیپ میں نظر آتے تھے۔ یہ ایک طرف سادگی کا سبق تھا، تو دوسری طرف قومی فخر کا احساس تھا۔ اس نے کانگرس پارٹی کو عام لوگوں سے منسلک کر دیا۔

اس کے برعکس مسلمانوں کا طبقہ اعلیٰ شیروانی اور اس کے ساتھ مختلف قسم کی ٹوپیوں کو استعمال کرتا رہا۔ جن میں ترکی، رام پوری، دو پلی اور قراقلی شامل تھیں۔ بعد میں مسلم لیگ والوں نے جناح کیپ کو متعارف کروایا مگر اس کو سب نے استعمال نہیں کیا۔ مسلم لیگ کے لیڈروں اور کارکنوں کا کوئی خاص لباس نہیں تھا۔ محمد علی جناح یورپی لباس پہنتے تھے۔ آخر زمانے میں انہوں نے شیروانی، پاجامہ اور جناح کیپ کا استعمال کیا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے شلوار قمیص کو پاکستان میں مقبول بنا کر اس کے استعمال کو عام کیا۔

قومی لباس کے سلسلہ میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں عورتوں کو شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ انہیں اس سے علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ اب وقت کے ساتھ قومی لباس کا تصور کمزور ہو رہا ہے۔ گلوبلائزیشن کے تحت مرد اور عورتیں مغربی لباس کو اختیار کر رہی ہیں۔ اس لئے قومی لباس کا استعمال سرکاری تقریبات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

شاہ عنایت شہید کی مزاحمتی تحریک

اگر تاریخ کو مرکز کے نقطۂ نظر سے پڑھا جائے تو اس میں ریاست کا یہ تصور سامنے آتا ہے کہ سیاسی استحکام اور مضبوط معیشت کے لئے ضروری ہے کہ ریاست کے ادارے، جن میں فوج، اور بیوروکریسی خاص طور سے شامل ہیں انہیں مستحکم ہونا چاہئے۔ ریاست اگر سیاسی وسعت کی خاطر دوسرے علاقوں پر قبضہ کرتی ہے تو یہ ایک اچھا قدم ہے کیونکہ اس کی وجہ سے پس ماندہ علاقے، وسیع سلطنت میں شامل ہوکر ترقی کریں گے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر مغلوں کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو اکبر کی امپیرلسٹ پالیسی صحیح ٹھہرتی ہے کہ اس نے سلطنت کی وسعت کی خاطر کوشش کی کہ پورے ہندوستان کو اپنے زیر اثر لائے۔ اکبر کا مشیر اور درباری مؤرخ ابوالفضل اس بات پر زور دیتا ہے کہ اس پالیسی کی وجہ سے جو علاقے مغل سلطنت کے دائرے میں آئیں گے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اگر تاریخ کو مرکز سے علیحدہ، صوبائی یا علاقائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تاثر بالکل اس سے الٹ ہوگا۔ ایک بڑی ایمپائر یا سلطنت کا حصہ بن کر علاقہ اپنی شناخت کو کھو بیٹھے گا، اس کی شمولیت سے اس کے کلچر اور رسم و رواج پر بھی اثر ہوگا۔ اور بعض صورتوں میں تو اس کے نتیجہ میں زبان تک بدل جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ شامل علاقے کے سماج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک وہ جو امپیریل طاقتوں کا ساتھ دیتے ہیں ان کی مدد کرتے ہیں اور اپنے ہی لوگوں کو غلامی کے لئے تیار کر کے ان کا استحصال کرتے ہیں اور خود کو مراعات یافتہ طبقہ بنا لیتے ہیں۔

دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جو مزاحمت کرتے ہیں۔ بغاوت کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں فقر، فاقہ، اذیت، کی زندگی گزار کر گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔ جو مزاحمت

کرتے ہیں۔ وہ باغی کہلاتے ہیں اور اس کی سزا میں موت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔

جب تک تاریخ کو مرکز کے نقطہ نظر سے لکھا جاتا ہے یہ باغی، مفسد، شورش پسند اور حکومت کے مخالف ہوتے ہیں۔ اکثر ان کے بارے میں یا تو تاریخ خاموش رہتی ہے یا معمولی سا تذکرہ کر دیتی ہے کیونکہ مراعات یافتہ طبقے نہیں چاہتے کہ تاریخ میں ان لوگوں کو باعزت مقام دیا جائے۔

کبھی یہ ہو جاتا ہے کہ جب امپیریل طاقت ٹوٹتی ہے اور علاقائی خودمختاری حاصل ہوتی ہے تو اس وقت ان شخصیتوں اور تحریکوں کو تاریخ سے نکال کر سامنے لایا جاتا ہے کہ جنہوں نے مزاحمت کی تھی لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ خودمختاری کے بعد اقتدار میں آتے ہیں وہ مزاحمتی تحریکوں اور شخصیتوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں اور انہیں تاریخی گمنامی میں رہنے دیتے ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم شاہ عنایت شہید کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ اگرچہ مغل سلطنت کا ایک حصہ تو ہو گیا تھا۔ مگر اس کے ثمرات اسے کوئی نہیں ملے۔ سندھ کی زمینوں سے لگان وصول تو کیا جاتا رہا۔ مگر اس کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا گیا۔ آخری عہد مغلیہ میں جب مغل سلطنت کمزور ہو رہی تھی تو اس کی جانب سے جو ناظم یا گورنر یہاں آتے تھے ان کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کرنا ہوتا تھا۔ جب کوئی سلطنت حالت زوال میں ہو تو اس صورت میں وہ مزاحمتوں اور بغاوتوں سے بہت زیادہ خوف زدہ ہو جاتی ہے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں فرخ سیر کے آتے آتے مغل سلطنت میں جگہ جگہ بغاوتیں ہو رہی تھیں اور سلطنت کے پاس اتنے ذرائع نہیں رہے تھے کہ وہ ان بغاتوں کا مقابلہ کرے۔ ان حالات میں مغل ناظم کو یہ خطرہ ہوا کہ شاہ عنایت، مغل ریاست اور اس کی اتھارٹی کو چیلنج کر رہے ہیں۔

یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے آخر شاہ عنایت مغل حکومت کے لئے خطرہ کیوں بنے؟ ہندوستان میں عوام کے لئے دو مراکز ایسے تھے کہ جن کی جانب وہ دیکھتے تھے محل یا قلعہ کہ جو حکمران یا گورنر کے اقتدار کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ یہاں دولت و طاقت اور سیاسی اختیارات جمع ہو جاتے تھے۔ عام لوگوں کے لئے یہاں تک پہنچنا اور اپنے مطالبات کی

بات کرنا مشکل تھا۔ یہ اہل ثروت اور مراعات یافتہ طبقہ کی آماجگاہ ہوا کرتا تھا۔

دوسری جانب صوفیاء کی خانقاہ ہوتی تھی۔ یہاں غریب و مفلس اور ستائے ہوئے لوگ روحانی سکون کی تلاش میں آتے تھے۔ یہاں شیخ تک رسائی آسان تھی۔ سماج میں عام آدمی کو جس قدر مسائل ہوتے تھے جب ان کا حل نہیں ملتا تھا تو وہ خانقاہ کی جانب رجوع کرتے تھے۔ محل، قلعہ یا خانقاہ کے درمیان بہت کم تصادم ہوا۔ یہ ضرور ہوا کہ کبھی خانقاہ کے شیخ نے ناراضگی ظاہر کر دی لیکن فوجی تصادم کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کرتے تھے۔

ہم عصر تاریخوں سے ہمیں جو مواد ملتا ہے ان میں سیاست کے مرکز اور روحانی مرکز میں اختلاف کی دو وجوہات بتائی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ دوسرے صوفیاء اس بات پر ناراض تھے کہ ان کے مرید بھی شاہ عنایت کی خانقاہ میں جا کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو رہے تھے۔ دوسرے سادات کا طبقہ تھا کہ جو اہل اقتدار سے رابطہ میں رہتے ہوئے مراعات حاصل کرتے تھے۔ وہ بھی اس نئے روحانی مرکز سے خوف زدہ تھے۔

اس کے علاوہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا ایک جگہ جمع ہو جانا اور کمیونل زندگی گزارنا اہل اقتدار کے لئے بہت خطرے کا باعث ہوتا ہے۔ جب ان کی خانقاہ پر حملہ کیا گیا تو خاص بات یہ ہے کہ شاید پہلی مرتبہ کسی صوفی نے فوجی لحاظ سے مزاحمت کی۔ اگرچہ ان کے مرید اس کے لئے تیار نہیں تھے اور مسلح افواج کے ساتھ مقابلہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا، مگر سیاست کی اس ناانصافی کے خلاف مزاحمت کرنا اور جان دینا، صوفیا کے گروہ کا تاریخ میں ایک اضافہ ہے۔

شاہ عنایت گرفتار ہوتے ہیں اور علماء کے فتویٰ کے مطابق واجب القتل ٹھہرتے ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ علماء کس طرح ہمیشہ اہل اقتدار کے لئے مذہب کو استعمال کرتے رہے ہیں۔ ان کے لئے حکمرانوں کی خوشنودی اصولوں سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔ سال 1718ء کو فتویٰ کے بموجب شاہ عنایت کو شہید کر دیا گیا۔

سندھ صوفیا کی سرزمین ہے۔ یہاں جگہ جگہ ان کے مزارات اور ان کی خانقاہوں کے آثار ہیں۔ مگر شاہ عنایت شہید کیوں دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہیں اور آج ان کو یاد

کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے؟ تاریخ اس کے واقعات، ماضی کی شخصیات اور تحریکیں حال کی تحریکوں کے لئے راہنمائی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ سندھ آج پھر اسی صورت حال سے دوچار ہے کہ جو شاہ عنایت کے دور میں تھی۔ مرکز آج بھی اس طرح سے طاقت ور ہے اور صوبوں کے حقوق کو غصب کئے ہوئے ہے۔ لوگوں کے مسائل آج بھی اسی طرح سے موجود ہیں۔ وہ اہل اقتدار تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ اب ان کو روحانی سکون دینے کے لئے خانقاہیں بھی نہیں رہیں۔ وہاں بھی ویرانی ہے۔ اس لئے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد اور مزاحمت کا راستہ ہے۔ یہ راستہ اب جمہورت نے لوگوں کو دے دیا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ مزاحمت اسی طرح سے ختم تو نہیں ہو جائے گی جیسے شاہ عنایت کو شہید کر کے اسے کچل دیا گیا تھا؟ آج کے جمہوری دور میں مزاحمت کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ اس میں لوگوں کی توانائیاں اور خواہشات ہیں۔ اس لئے جدوجہد ٹھہر سکتی ہے مگر ختم نہیں ہو سکتی۔ اس لئے شاہ عنایت اور ان کی مزاحمتی تحریک موجودہ جدوجہد کے لئے راہنمائی کا باعث ہے۔ مزاحمت اور بغاوت کرنے والی شخصیتیں اور تحریکیں تاریخ میں گمنام نہیں ہو جاتی ہیں بلکہ اس کے باہر نکل کر دوبارہ سے زندہ ہو جاتی ہیں۔

اخلاقی قدریں اور سماجی تبدیلی

ہمارے جیسے معاشرے کہ جو بحرانوں کا شکار ہیں، جہاں سیاسی بے چینی، افراتفری، اور عدم استحکام ہے۔ اور جہاں لوگ معاشی مسائل میں الجھے ہوئے روزمرّہ کے مسائل سے دوچار ہیں، اگر ان سے کہا جائے کہ اخلاقی اقدار اور روایات سماجی تبدیلی لا سکتی ہیں تو اس سے زیادہ بڑا مذاق اور کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ معاشرے وعظوں اور نصیحتوں سے تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔ سماجی تبدیلی کے لئے معاشی اور سیاسی تبدیلی کا آنا ضروری ہے۔ اخلاقی قدریں ان قوتوں کی تابع ہوتی ہیں یہ خود سے آزادانہ یا خودمختار ہو کر کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی ہیں۔

اخلاقی قدروں کا تاریخ کے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو ہمیں تین باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ نمبر ایک طاقت ور اور صاحب اقتدار طبقہ اخلاقی اقدار کو اپنے مفادات کے تحت نئے معنی اور مفہوم دیتا ہے۔ مثلاً انصاف، رواداری، شرافت، نیکی اور بدی وغیرہ۔ ان سب کے معنی ان کے نزدیک جدا ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک اچھا اور مثالی معاشرہ وہ ہے کہ جو ان کا وفادار ہو، ان کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہو، جو مطالبات نہ کرے، حق نہ مانگے اور صبر و قناعت سے زندگی گزارے۔ جو جس حالت میں ہے اسی کو خدا کی رضا سمجھے۔ ان اخلاقی قدروں کی تلقین اور تبلیغ مذہبی تعلیمات اور ادب کے ذریعہ کی جاتی ہے تاکہ اس کو پختہ بنیاد فراہم کی جا سکے۔ اگر آپ شیخ سعدی کی گلستاں و بوستاں پڑھیں تو اس میں آپ کو انہیں اخلاقی قدروں کی پابندی کے لئے کہا گیا ہے۔ ایک زمانہ میں ان اخلاقی اقدار پر وسیع ادب تخلیق ہوا تھا، جس میں اخلاق ناصری بہت مشہور تھی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ اہل اقتدار ان اخلاقی قدروں کے ذریعہ معاشرہ میں ترتیب و

تنظیم پیدا کرنا چاہتے ہیں۔تا کہ سماج کا ڈھانچہ متاثر نہ ہو،لوگ ذہنی طور پر حالات کو قبول کر لیں اور جو جگہ ان کے لئے متعین کردی گئی ہے اسے تجاوز کی کوشش نہ کریں۔

دوسرا یہ کہ جب کسی گروہ، قوم یا ملک کے پاس طاقت آجاتی ہے اور وہ اس کا استعمال اس لئے کرتا ہے کہ طاقت کو اور زیادہ بڑھایا جائے تو اس موقع پر بھی اسے اخلاقی قدروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب حکمراں، فاتح اور سامراجی قوتیں دوسروں کے ملکوں پر حملے کرتی ہیں، لوگوں کا قتل عام کرتی ہیں، ان کا مال و اسباب لوٹتی ہیں تو انہیں ان سب باتوں کے لئے اخلاقی جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لئے کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مہذب ہیں، اور غیر مہذب اقوام کو تہذیب سکھانے کے لئے ان کے ملکوں کو فتح کر رہے ہیں۔کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اس ملک کے عوام پر بڑا ظلم ہو رہا ہے اور وہ انہیں ان ظلم و ستم سے بچانے کے لئے قبضہ کر رہے ہیں۔کبھی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ گمراہ ہیں، اور ان کا کام ہے کہ ان کا مذہب تبدیل کر کے انہیں راہِ راست پر لایا جائے۔ اس اخلاقی جواز کے پیچھے ان کے معاشی اور سیاسی عزائم ہوتے ہیں، مگر دنیا کے سامنے وہ خود کو اخلاقی اقدار اور روایت کا چیمپئن ثابت کرتے ہیں۔

اخلاقی اقدار کو لوگ بھی اپنے تحفظ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جب بھی جابروں، آمروں اور ظالم حکمرانوں کے خلاف تحریکیں چلتی ہیں تو لوگ انصاف، عدل، مساوات، حقوق اور مروت کی بات کرتے ہیں۔ یہ قدریں انہیں حوصلہ دیتی ہیں کہ وہ اپنے حقوق کی جدوجہد میں آگے بڑھیں۔

اس لئے اخلاقی قدریں اپنی جگہ رہتی ہیں، مگر ان کے معنی اور مفہوم آفاقی نہیں ہیں۔ یہ وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔حکمراں کے نزدیک انصاف کا مطلب ہے کہ اپنے مخالفوں اور باغیوں کا خاتمہ کر کے امن و امان قائم کرے۔ایک غریب کے نزدیک انصاف کا مطلب ہے ظلم و ستم سے نجات اور معاشرہ میں جائز مقام کا ملنا۔

لہٰذا سماج کی تبدیلی، اخلاقی اقدار کے معنی و مفہوم کو بدلتی ہے۔ ماضی میں جو نیکی تھی وہ حال میں برائی ہو جاتی ہے۔اور یہ برائی شاید مستقبل میں پھر نیکی ہو جائے۔اس لئے اخلاقی قدریں سماج کو تبدیل نہیں کر سکتی ہیں، بلکہ سماج کی تبدیلی سے ان کے مطالب بدل

جاتے ہیں۔ مثلاً شرم وحیا کے معیار ہر معاشرہ میں جدا ہوتے ہیں۔ جب 19 ویں صدی میں انگریز ہندوستان میں آئے تو ان کے ہاں اس وقت شرم وحیا کے لئے وکٹورین معیار تھا اس لئے انہیں ہندوستان میں فحاشی اور عریانی نظر آئی۔ آج ہم اہل مغرب کے ہاں شرم وحیا کا ناپید ہونا اور فحاشی دیکھ رہے ہیں۔ جب کہ ان کی نظروں میں یہ سب روزمرّہ کی زندگی کا حصہ ہے۔

اس مطالعہ کی روشنی میں اب اس پر غور کرنا ہے کہ کیا پاکستان میں اخلاقی قدریں ہیں، اور اگر ہیں تو ان کو کن معنوں اور مفہوم میں بیان کیا جاتا ہے۔ اوّل تو جب پاکستانی معاشرے کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ معاشرہ زوال پذیر نہیں بلکہ زوال شدہ ہے۔ کیونکہ اس کے سیاسی اور معاشی ادارے عوام کے بجائے حکمراں طبقوں کے مفاد میں کام کررہے ہیں۔ اس لئے معاشرے میں اخلاقی قدروں کے معنی بدل گئے ہیں، ایمانداری، دیانت داری، پاکیزگی، نیکی، رحمدلی، فیاضی، سخاوت، انسانیت، اور دوستی کی روایات کو دیکھیں تو وہ ایک دوسرے ہی تناظر میں نظر آتی ہیں، اس کی جگہ منافقت، عیاری، دشمنی، بدمعاش، جھوٹ، بدعنوانی، اور غنڈہ گردی چھا گئی ہیں، مگر ان روایات نے اخلاقی قدروں کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔ اب ایمانداری بدنامی کا باعث ہوگئی ہے، سچ بولنا نقصان پہنچاتا ہے، دوسروں کے ساتھ نیکی کرنا، خود کو اذیت میں مبتلا کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے ماحول میں اخلاقی قدریں بھی منفی معنوں میں استعمال ہونے لگتی ہیں اور ان کا استعمال صرف وعظوں، خطبوں اور نصیحتوں میں رہ جاتا ہے جب کہ عملی زندگی سے ان کا رابطہ کٹ جاتا ہے۔

ایک زوال شدہ معاشرے میں اخلاقی قدریں بھی کمزور ہوکر ختم ہو جاتی ہیں۔ معاشرہ ایک ایسے جنگل کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ جہاں ہر فرد ہر حربہ اور طریقہ کو استعمال کر کے زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کوشش میں وہ اخلاقی قد.وں کا سہارا نہیں لیتا ہے۔ اس وقت ہم ایک ایسے ہی بحران سے گزر رہے ہیں۔

سیاست اور اخلاقی قدریں

عام طور سے لوگ سیاست اور سیاسی طریقۂ کار کو عام سماجی اخلاقی قدروں اور رویّوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اور جب اس میں تضادات پاتے ہیں تو اس سے مایوسی ہوتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سیاست اور اخلاقی قدروں میں کوئی ربط وضبط نہیں ہوتا ہے۔ سیاست کا مقصد کامیابی، فتح اور کامرانی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ کن ذرائع سے یہ کامیابی حاصل کرتی ہے، یہ بات اس وقت بے معنی ہوجاتی ہے جب مقصد پورا ہوجاتا ہے۔

اسی وجہ سے چانکیہ نے ''ارتھ شاستر'' اور میکاولی نے ''پرنس'' میں سیاسی مقاصد اور ان کے حصول کے لئے تمام ذرائع کو درست اور صحیح کہا ہے۔ جب مقصد حاصل ہوجاتا ہے تو پھر کوئی نہیں پوچھتا کہ اخلاقی قدروں کو پامال کر کے ہوا ہے یا ان کا پابند ہو کر۔

دراصل سیاست میں جب اول و آخر مقصد مفادات کا حصول ہو، تو اس وقت سیاستداں اور حکومتیں اپنی اخلاقی قدریں خود بناتی ہیں تاکہ اپنے مقاصد کو جواز دے سکیں۔ مثلاً جب شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد، تخت کے تمام دعویداروں کو قتل کرا دیا، تو اس وقت بھی عام لوگ اس عمل سے سخت ناراض ہوئے کہ ان معصوم لوگوں کو کیوں گلا گھونٹ کر مارا گیا۔ مگر دربار کے ایک مورّخ صالح کنبوہ نے اپنی کتاب ''عمل صالح'' میں اس کا اخلاقی جواز اس طرح سے پیش کیا کہ اگر تخت کے دعویدار زندہ رہتے اور اقتدار کے لئے جنگ کرتے تو اس کے نتیجہ میں لاتعداد لوگ مارے جاتے اور بے اندازہ خون بہتا، لہٰذا اس قتل و غارت گری کو روکنے کے لئے ان دعویداروں کو راستے سے ہٹایا گیا۔ اب اس اخلاقی جواز سے عالمگیر کا اپنے بھائیوں کا قتل بھی درست ہوجاتا ہے، بلکہ جس حکمران نے بھی اس پر عمل کیا، دراصل اس نے عام لوگوں کے مفاد میں کیا، اور ملک کو خانہ جنگی سے بچایا۔

غرض سیاست اپنی اخلاقی اقدار، ہر دور میں خود کو تشکیل کرتی ہے اور اپنے اعمال کو ان کی بنیاد پر صحیح ثابت کرتی ہے۔ کولونیل طاقتوں نے جب ایشیا و افریقہ کے ملکوں پر حملے کئے تو اس کا بھی اخلاقی جواز تھا کہ ان لوگوں کو مہذب بنایا جائے اور ان کو عیسائیت میں لا کر ان کی دنیا و آخرت کو بہتر بنایا جائے۔

تاریخ کے اس تسلسل میں موجودہ دور میں امریکی امپیریل ازم اور اس کی اخلاقی قدروں کا تجزیہ کیا جائے تو جو اعلانات ہوئے ہیں، اور ہو رہے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ اپنے حملوں، اور دوسرے ملکوں پر قبضہ اور ان کے ذرائع کو استعمال کرنے کا جواز دے رہا ہے۔ عراق پر حملے کا اخلاقی جواز صدام حسین کی آمریت، اور یہ کہ اس نے اپنے شہریوں کا جو قتل عام کیا، وہ انسانیت کے خلاف تھا، اس لئے اس کو اقتدار سے ہٹانا، امریکہ جیسی بڑی طاقت کا اخلاقی فرض تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دعویٰ کہ عراق کے پاس مہلک ہتھیاروں کا ذخیرہ ہے (حالانکہ سب سے زیادہ مہلک ہتھیار تو خود امریکہ کے پاس ہیں) اور وہ دنیا کے لئے خطرہ ہے، اس لئے عراق پر قبضہ ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اعلانات بھی کئے گئے کہ یہ جنگ مغربی تہذیب، مغربی روایات و اقدار کو بچانے کے لئے کی گئی ہے، کیونکہ عراق ان کا مخالف تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا گیا کہ عراق میں آمریت کی جگہ جمہوریت لائی جائے گی۔

عراق کے ساتھ ہی افغانستان میں جنگ اور وہاں طالبان کی مزاحمت کو ختم کرنے کے لئے جو اخلاقی جواز دیا گیا ہے وہ یہ کہ دنیا دہشت پسندوں کے نرغے میں ہے، لہٰذا اس دہشت گردی کو روکنے کے لئے جب گاؤں، دیہاتوں، اور شہروں پر بمباری کی جاتی ہے تو اس میں عام لوگ کہ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے ہیں، وہ مارے جاتے ہیں، مگر اس پر کوئی تاسف یا ندامت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ یہ قتل و غارت گری امن اور تہذیب کو بچانے کے لئے ہے۔

''گوئٹے ناموبے'' میں قیدیوں کو بغیر مقدمے کے رکھا جاتا ہے، اس کی دلیل بھی یہ ہے کہ یہ خطرناک قیدی ہیں، اس لئے نہ تو ان پر مقدمہ چلانے کی ضرورت ہے، اور نہ ان کو صفائی کا موقع دینا چاہئے بلکہ انہیں تشدد، اور اذیت دے کر اپنی مرضی کے بیانات

لینے چاہئیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک لوگوں کی جدوجہد اور قربانیوں کے ذریعے جو بنیادی حقوق حاصل کئے گئے تھے جن میں تحریر و تقریر کی آزادی، سیاسی قیدیوں کو صفائی کا موقع دینا، قیدیوں کو تشدد اور اذیت نہ دینا اور حکومتوں کو اصل واقعات سے عوام کو آگاہ کرنا، وغیرہ، یہ سب امریکی امپیریل ازم کے مقاصد کے تحت ختم ہو گئے، اب سیاسی قیدیوں کو خفیہ طریقہ سے اٹھا لیا جاتا ہے، اور انہیں جہاں چاہیں خفیہ مقامات پر رکھا جاتا ہے، ان کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا؟

امریکی امپیریل ازم کے اثرات عالمی ہی نہیں، بلکہ خود امریکہ میں بھی ہو رہے ہیں، جہاں ریاست کے ان اقدامات پر تنقید کرنے والوں کو حکومت کی ایجنسیوں کے ذریعہ ہراساں کیا جاتا ہے۔ ان کے ٹیلی فون، ای میل اور خط و کتابت کو خفیہ طریقوں سے چیک کیا جاتا ہے، یونیورسٹیوں میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلباء کون سی کتابیں پڑھ رہے ہیں، اور ان کے سیاسی خیالات کیا ہیں؟

دیکھا جائے تو امریکی امپیریل ازم نے پوری دنیا کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا ہے، اور اس کی شرائط یہ ہیں کہ یا تو ان کے ماتحت کر دیا جائے، ورنہ ان کا عراق و افغانستان جیسا حشر ہو گا، اور یہ سیاسی مفادات وہ اپنے بنائے ہوئے اخلاقی اقدار کے ذریعے پورے کر رہے ہیں۔

شائستگی

کسی قوم کے مہذب ہونے کی نشانی اس کی گفتگو، ادب آداب، اور شائستگی میں ہوتی ہے، اسی وجہ سے ایڈمنڈ برک، جو کہ ایک انگریز سیاستداں تھا، اس نے کہا تھا کہ اخلاق قانون سے زیادہ ضروری ہیں، کیونکہ ان سے معاشرہ آپس میں جڑتا ہے، ایک دوسرے کا احترام پیدا ہوتا ہے، اس کی سماجی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ ادب آداب، اخلاق اور لہجہ کی نرمی اور شائستگی کا اثر فرد کے جسم اور اس کے چہرے کے خدوخال پر بھی ہوتا ہے۔ اگر لہجہ میں کرختگی اور درشتگی ہوتی ہے، تو اس سے جسم کی حرکات اور چہرے کا اتار چڑھاؤ بھی بگڑ جاتا ہے، کیونکہ غصہ، لہجہ کی سختی اندرونی جذبات کو ابھارتی ہے، جو انسان کو شدت پسند بنا دیتی ہے۔ اس کے برعکس اگر لہجہ میں شائستگی ہو، بات چیت میں نرمی ہو، گفتگو سکون کے ساتھ کی جائے، تو اس سے جذبات ٹھنڈے رہتے ہیں، بھڑکتے نہیں ہیں۔ یہ خوبصورتی کی علامت ہو جاتے ہیں، چہرے پر شگفتگی آ جاتی ہے، اور جسم کی حرکات میں تناؤ نہیں ہوتا ہے۔

کرختگی اور شائستگی دو طریقے ہیں کہ جن کے ذریعہ بات چیت کی جاتی ہے۔ اس کا اثر سماج کے روزمرہ کے معمولات پر ہوتا ہے۔ اگر کسی سے درشتگی سے مخاطب ہو کر بات کی جاتی ہے، یہ ایسے ہی جیسے کوئی ہتھیاروں سے حملہ کر کے کسی کو زخمی کر دیتا ہے۔ اگر طبقہ اعلیٰ کے لوگ اپنے ماتحتوں سے بدتمیزی سے گفتگو کرتے ہیں، تو وہ زخمی ہونے کے باوجود، ان کو چھپاتا ہے، اور اس رویہ کو برداشت کرتا ہے۔ مگر یہ گھاؤ اس کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔ لیکن اگر اسی لہجہ میں برابر منصب کے لوگوں سے گفتگو کی جائے تو وہ اسے برداشت نہیں کرتے ہیں اور اسی لہجہ میں جواب دیتے ہیں۔ اس قسم کی کیفیت جنگ کا ماحول پیدا کر دیتی ہے۔ بات اگر بڑھ جائے تو پھر گالم گلوچ تک نوبت پہنچتی ہے۔

اگر یہ رویہ سماج میں عام ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ روزمرہ کی زبان بگڑ جاتی ہے اس میں ایسے الفاظ آ جاتے ہیں کہ جنہیں تہذیب کے دائرے میں نہیں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کو ایک خوبی سمجھنے لگتے ہیں۔ اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ گالیوں کی مدد سے وہ اپنے جذبات کا اظہار بہتر طریقے سے کرتے ہیں۔ لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب شائستگی سماج میں جڑ پکڑتی ہے تو یہ لوگوں کو قریب لاتی ہے، طبقاتی فرق کے باوجود اس کی وجہ سے لوگوں میں لگاؤ ہوتا ہے، کیونکہ عام آدمی کو اس سے سکون و اطمینان ملتا ہے کہ سماج میں اس کی عزت ہے، اور طبقہ اعلیٰ کے لوگ بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔ لیکن اگر مراعات یافتہ اور دولت مند لوگ اپنے سے نچلے طبقوں سے تو تکار سے بات کریں، اور لہجہ میں سختی ہو، تو اس سے طبقاتی نفرت اور بڑھ جاتی ہے، اس لئے ہم جاگیردارانہ معاشروں میں دیکھتے ہیں کہ اس کے کلچر میں زبان اور لہجہ کا تعلق طبقاتی ہوتا ہے لیکن جہاں صنعتی انقلاب آیا، اس نے اخلاقی رویوں کو بھی تبدیل کرنا شروع کر دیا۔

مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح تجارت اور معیشت نے اخلاق اور شائستگی کو فروغ دیا، بڑے بڑے تجارتی اسٹور ہوں یا چھوٹے دکاندار، ان کے سیلز مین، یا سیلز گرلز کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ گاہکوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے، ان کا مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا جائے، اس سے 'آپ' یا 'سر' کہہ کر خطاب کیا جائے، اور کوشش کی جائے کہ وہ ناراض نہ ہو۔ اسی رویہ کو دفتروں اور پبلک مقامات پر رواج دیا گیا ہے۔

اب اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پاکستان کے سماج میں آخر کیوں لوگوں کے لہجہ میں شائستگی، نرمی اور خوش اخلاقی کے بجائے سختی، درشتگی اور کرختگی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو سماج کی طبقاتی تفریق ہے، جو لوگوں کو تقسیم کئے ہوئے ہے۔ دوسرے اتھارٹی کا استعمال ہے۔ اتھارٹی کئی قسم کی ہوتی ہے، سیاسی، سماجی اور مذہبی، جس کے پاس اتھارٹی ہوتی ہے، وہ دوسروں پر اسے استعمال کر کے اپنی شخصیت کو ابھارنا چاہتا ہے۔ چاہے وہ بڑے افسر ہوں، یا کلرک، یا چوکیدار، یہ اتھارٹی سے اسے ایک ایسا ہتھیار فراہم کرتی ہے کہ جسے استعمال کر کے وہ دوسروں کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ اس لئے اس کے لہجہ میں سختی ہوتی ہے، کبھی وہ رعونت کا مظاہرہ کرتا ہے، اور دوسروں کو ذلیل کر کے مسرت حاصل کرتا ہے۔

لہٰذا جب سماج میں لوگوں کے عام رویے یہ ہو جائیں کہ وہ دلیل کے بجائے جذبات کا سہارا لیں، زور سے بول کر اپنی بات منوانے کی کوشش کریں، تو ایسی صورت میں سماج میں شائستگی، ادب آداب اور اخلاق کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس کا مظاہرہ ہم اکثر بحث و مباحثہ میں دیکھتے ہیں کہ جہاں ایک دوسرے پر الزامات لگائے جاتے ہیں، اپنے مخالفوں کی تذلیل کی جاتی ہے، اور انہیں حقارت سے پکارا جاتا ہے۔

یہی حال ہمارے روزمرہ کے معمولات میں ہے کہ ہم بہت کم معاف کیجئے اور غلطی ہوگئی، قسم کے فقرے سنتے ہیں، اگر کسی سے معمولی تنازعہ ہو جائے تو وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دینے کی شکل میں اور بڑھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں خوش اخلاقی کے جو الفاظ ہیں، وہ آہستہ آہستہ متروک ہوتے جا رہے ہیں، ان کی جگہ وہ الفاظ اور ان کی جگہ نازیبا الفاظ، اور نامناسب اور غیر شائستہ جملے آ رہے ہیں۔

کیا ہماری غیر شائستہ گفتگو اور زبان ہمارے غیر متمدن ہونے کی نشانی ہے؟ کیا ہم میں احترام انسانیت ختم ہو گیا ہے اور ہم وحشیانہ اور پرتشدد جذبات کا شکار ہو گئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا سماج اور زیادہ ٹوٹے گا؟ کیا اور زیادہ فسادات اور تنازعات ہوں گے؟ اور کیا اخلاقی قدروں کا یہ زوال ہمیں اور زیادہ پس ماندہ بنائے گا؟ یہ وہ سوالات ہیں کہ جن پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔

آفات، تباہی اور گناہ

دنیا میں ایک زمانہ سے فطری آفات آتی رہی ہیں، ان میں زلزلے، سیلاب، آتش فشاں پہاڑ کا پھٹنا اور لاوہ ابلنا اور ریت و گرد کے طوفان وغیرہ۔ جب انسان نے آبادیاں بسائیں اور مل جل کر رہنا شروع کیا تو اس کے نتیجہ میں وبائیں آئیں جن میں پلیگ، ہیضہ، فلو، مختلف قسم کے بخار اور بیماریاں۔ ان کے علاوہ فطرت کی جانب سے لوگ خشک سالی کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ قحط کے نتیجہ میں ہزار ہا فاقے سے مرتے رہے ہیں۔ اس لئے جب بھی یہ فطری، آسمانی، اور انسان کی پیدا کردہ آفات آئیں، تو ابتداء میں اس کے لئے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ یہ سب کیوں ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں جو چیز بھی اس کی سمجھ اور فہم سے بالاتر تھی اسے اس نے دیوتاؤں سے منسوب کر دیا۔ اور اس سوال کا جواب بھی خود ہی دیدیا کہ یہ عذاب اور آفات دیوتاؤں کی جانب سے اس لئے آتی ہیں، کیونکہ لوگ ان کی اطاعت نہیں کرتے ہیں ان کی پوجا خلوص دل اور نیت سے نہیں کرتے ہیں، اس لئے وہ انسان کو سبق دینے کے لئے یہ آفات بھیجتے ہیں۔

یہی دلیل آگے چل کر یہودیوں، عیسائیوں، اور مسلمانوں کے مذہبی راہنماؤں نے اختیار کر لی کہ زلزلہ ہو یا سیلاب یا کوئی وباء یہ لوگوں کے گناہوں کے نتیجہ میں آتی ہے اور جب یہ آفات آتی ہیں تو اس میں اچھے و برے، نیک و بد سب ہی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس دلیل سے اہل مذاہب کے سربراہ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کا مذہب کے بارے میں عقیدہ مضبوط ہو جائے اور جب وہ مذہب اور اس کی رسومات کی پابندی کریں گے تو اس سے یقیناً اس کی سربراہی اور زیادہ مضبوط ہوگی۔ اس دلیل کا ایک اہم نتیجہ یہ تھا کہ انسان ان آفات کے مقابلہ میں بے بس و مجبور ہے۔ یہ بطور سزا اور عذاب کے آتے ہیں، لہٰذا اسے ان

کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہئے اور ان کا مداوہ کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

مگر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان وعظوں کے باوجود اور ان آفات سے ڈرانے و دھمکانے کے باوجود انسان نے اپنی فطرت نہیں بدلی اور وہ اسی طرح سے بدعنوانیوں، خرابیوں، اور برائیوں میں مبتلا رہا۔ اس نے اس تباہی سے کوئی سبق سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

لیکن جہاں عقیدہ انسان کی تحقیق اور جستجو کو روکتا ہے، وہاں عقل اس کو بار بار اکساتی ہے کہ ہر ہونے والی چیز کی وجوہات تلاش کرے۔ اس نے سائنس و ٹیکنالوجی کو پیدا کیا اور انسان نے کھوج لگانا شروع کیا کہ زلزلہ اس لئے نہیں آتا کہ زمین جس گائے کے سینگوں پر کھڑی ہے جب وہ سر ہلاتی ہے تو زمین بھی ہل جاتی ہے۔ بلکہ اس کی سائنسی وجوہات ہیں اس لئے انہوں نے آتش فشاں پہاڑ، سیلاب، طوفان، اور وباؤں کے بارے میں تحقیق کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے آہستہ آہستہ وباؤں پر قابو پالیا کیونکہ یہ انسان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ صفائی اور غذا کی احتیاط کے ساتھ دواؤں کی ایجادات نے انسان کو بہت سی موذی بیماریوں سے نجات دلا دی۔ اس طرح اس نے ایسے آلات ایجاد کر لئے کہ جن کی مدد سے وہ معلوم کر سکتا ہے کہ کب زلزلہ آ سکتا ہے، اور کب سیلاب دھاوا بول سکتا ہے۔ اس لئے اگر پہلے سے ان سے مقابلہ کرنے کی تیاری کی جائے تو نقصانات کم ہو سکتے ہیں۔

وہ ملک کے جہاں بہت زلزلے آتے ہیں، جیسے جاپان انہوں نے زلزلہ آنے والے علاقوں میں ایسے مکانات تعمیر کرنا شروع کئے کہ جو اس کی شدت کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے عمارتوں کی تعمیر، ان کی بلندی، ان میں استعمال ہونے والے میٹریل پر پابندی لگائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہاں زلزلے آتے ہیں تو نقصانات کم سے کم ہوتے ہیں۔

پاکستان میں زلزلے کے نتیجہ میں جو تباہی آئی ہے اس کے بارے میں مسلسل یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے اور خدا کی جانب سے عذاب ہے۔ اگر ہم نے اپنی سوچ کو یہیں تک رکھا تو آئندہ آنے والی آفات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں رہیں گے۔ اسے عذاب الٰہی کہنے سے ہماری قوم اپنے اخلاق کو نہیں سدھار رہی ہے، کیونکہ لوگ اسی طرح سے اشیاء میں ملاوٹیں کر رہے ہیں، رشوتیں لے رہے ہیں، مہنگی چیزیں بیچ رہے

ہیں، چوری اور ڈاکے ڈال رہے ہیں، اور جھوٹ، فریب اور بدمعاشی میں مبتلا ہیں۔

اس لئے یہ غور کرنے کی بات ہے کہ کیا ان علاقوں میں کہ جہاں یہ زلزلہ آیا اور اس کے نتیجہ میں تباہی آئی، کیا وہ ملک کے دوسرے حصوں کے مقابلہ میں زیادہ گنہگار تھے؟ اگر ایسا ہے تو پھر دوسرے محفوظ علاقے کے لوگوں پر کیا خدا کی رحمت ہے کہ وہ اس عذاب سے بچ گئے؟

لہٰذا اس دلیل سے آگے بڑھ کر سوچنا ہو گا، اور اب ان علاقوں میں کہ جہاں زلزلہ آیا وہ ایسے مکانات، عمارتیں اور پلازہ بنانے ہوں گے کہ جو زلزلہ کو سہہ سکیں۔ اس سے سبق سیکھتے ہوئے پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی کہ جہاں مخدوش عمارتیں ہیں، اور جہاں بلڈر حضرات نے منافع کی خاطر کمزور اور غیر محفوظ عمارتیں بنا کر لوگوں سے پیسہ بٹورا ہے ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے تاکہ وہ آئندہ آنے والی آفات کا شکار نہ ہوں۔ اور یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ انسان اپنی تباہی خود لاتا ہے، اس میں الٰہی قوتوں کو شریک کرنا، اور انہیں الزام دینا، خود فریبی ہے۔

آئن اسٹائن کی واپسی

موجودہ صدی کو آئن اسٹائن کی صدی قرار دیا گیا ہے۔ یہ اعزاز اس وجہ سے ہے کہ اس نے جو سائنسی تحقیقات کی تھیں، اس کو تسلیم کیا جائے اور اس کی علمی و سائنسی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ آئن اسٹائن جرمنی میں پیدا ہوا، اس کی تعلیم و تربیت اور ملازمت کا آغاز یہیں پر ہوا، اور اسی ملک میں رہتے ہوئے اس نے سائنسی تحقیقات کیں۔

جب جرمنی میں ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی برسرِ اقتدار آئی، تو اس نے یہودیوں کے خلاف نفرت و تعصب کی ایک ایسی تحریک چلائی کہ جس کی وجہ سے یہودی نژاد لوگوں کے لئے جرمنی میں رہنا مشکل ہو گیا۔ لہٰذا ان کی ایک بڑی تعداد جن میں شاعر، ادیب، موسیقار، فلسفی، سائنسداں اور اساتذہ تھے وہ جرمنی سے دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ جب جرمنی میں آمرانہ جبر و تشدد اور زیادہ بڑھا تو اس صورت میں ایسے تمام دانشور جو نازی پارٹی کے نظریات کے مخالف تھے انہیں یا تو جیلوں میں ڈال دیا گیا، مروا دیا گیا، یا یہ لوگ بھی جرمنی سے جلاوطن ہو کر یورپ اور امریکہ چلے گئے۔

دانشوروں اور سائنسدانوں کی ایک بڑی تعداد کے انخلا نے جرمنی کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کو بے انتہا متاثر کیا۔ ان کی یونیورسٹیاں اجڑ کر رہ گئیں۔ ان کی علمی و ادبی اور ذہنی تخلیقات بنجر ہو گئیں، ایسے میں صرف وہ لوگ رہ گئے کہ جو ریاست کے نظریات کے حامی تھے اور جو اپنے فن و ادب کو نازی پارٹی کے لئے صرف کر رہے تھے۔

جب بھی کسی ملک میں آمرانہ حکومت ہوں اور وہ اپنے دانشوروں کو آزادی رائے کے مواقع نہ دیں، ان پر جبر و تشدد کریں، اور ان کی تخلیقات کے راستے بند کر دیں تو ایسے معاشروں میں ذہنی و ثقافتی ترقی رک جاتی ہے اور وہ پس ماندہ ہو کر تاریخی گمنامی میں چلے جاتے

ہیں۔ لیکن ایک آمرانہ حکومت چاہتی بھی یہی ہے کہ وہ ایسے پس ماندہ معاشرہ پر حکومت کرے کہ جہاں شعور و آگہی نہ ہو اور لوگ خاموشی سے ان کی اطاعت و تابعداری کریں۔

دوسری جانب ان جلاوطن دانشوروں اور مفکرین سے وہ ملک اور معاشرے فائدہ اٹھاتے ہیں کہ جہاں یہ لوگ پناہ لیتے ہیں۔

نازی پارٹی کے دور میں جہاں دوسرے اسکالرز ملک چھوڑ کر گئے ان میں آئن اسٹائن بھی تھا۔ یہ امریکہ کی پرنسٹن یونیورسٹی میں آخری وقت تک پروفیسر رہا، اور امریکہ ہی میں اس کی وفات ہوئی۔ (1955)

جنگ عظیم اور اس میں ہونے والی شکست نے جرمنی کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ جہاں وہ جمہوری اداروں اور روایات کو مستحکم کر رہے ہیں۔ تاکہ مستقبل میں کسی آمریت کا سامنا نہ کرنا پڑے، وہیں وہ اپنے کھوئے ہوئے دانشوروں اور عالموں کو واپس لے رہے ہیں۔ ان میں آئن اسٹائن بھی ہے۔ انہوں نے اسے اپنانے کا اعلان کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جرمنی اپنی ماضی کی غلطیوں کو تسلیم کر رہا ہے، اس نے اپنے اسکالرز کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، اس پر نہ صرف وہ شرمندہ ہے بلکہ معافی بھی مانگ رہا ہے۔

یہ ایک صحت مند روایت ہے۔ خاص طور سے ان ملکوں کے لئے کہ جہاں آمرانہ حکومتیں رہیں تھیں، یا اب بھی ہیں اور جو اپنے منحرف دانشوروں کے ساتھ تعصب کا سلوک روا رکھتے ہیں۔

مغرب کے ملکوں میں جمہوری روایات اور عوامی شعور و آگہی کی وجہ سے ماضی کی غلطیوں کو تسلیم کرنے کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اس کی ایک مثال مرحوم پوپ جان پال کی ہے کہ جنہوں نے بالآخر کیتھولک چرچ کی اس غلطی کو تسلیم کیا کہ جو اس نے گیلیلیو کے ساتھ کی تھی۔ چرچ نے نہ صرف غلطی کو تسلیم کیا بلکہ اس معتوب سائنسداں کو اس کا صحیح مقام بھی دیا۔ اگرچہ دیکھنے میں یہ بات مضحکہ خیز لگتی ہے کیونکہ وقت نے گیلیلیو کو صحیح ثابت کر کے اسے ایک عظیم سائنسداں تسلیم کر لیا تھا جب کہ چرچ کی جہالت افسوس ناک تھی۔ مگر اس عمل نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ جلد یا بدیر اگر غلطی کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے ذہن کی سوچ صاف اور واضح ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم بھی اپنے ان دانشوروں، مفکروں، سائنسدانوں اور عالموں کو تسلیم کرنے پر تیار ہیں کہ جنہیں ہم معتوب کر چکے ہیں یا جنہیں ہم اپنے میں سے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثال تو موجودہ دور میں ڈاکٹر عبدالسلام کی ہے کہ نوبیل انعام یافتہ ہیں، مگر احمدی ہونے کے سبب ہم انہیں اپنانے پر تیار نہیں ہیں۔ کیا انہیں تسلیم کرنے کے لئے ہمیں اس وقت تک کا انتظار کرنا پڑے گا کہ جب تک معاشرہ ذہنی طور پر پختہ نہ ہو؟

ریاستی سطح پر تو ہم اب تک جوش اور فیض کو بھی اپنانے پر تیار نہیں ہیں۔ اگر منحرف دانشوروں اور مفکرین کو اپناتے بھی ہیں تو ان کی تخلیقات کو مسخ کر کے۔ جس کی ایک مثال سعادت حسن منٹو کی ہے کہ نصاب کی کتابوں میں اس کے افسانوں کو مرضی کے مطابق تبدیل کر دیا گیا۔ اب سرکاری دانشور منٹو کے افسانوں کی وہ تفسیر پیش کر رہے ہیں کہ جو ریاست کے لئے قابل قبول ہو۔

پاکستان کی اس صورت حال میں ہمارے دانشوروں اور مفکرین کی ایک خاص تعداد باہر کے ملکوں میں پناہ لے چکی ہے۔ اس ملک میں رہتے ہوئے جو لوگ متبادل نظریات و خیالات پیش کر رہے ہیں، وہ ریاست اور معاشرے کی جانب سے اس قدر پابندیوں کا شکار ہیں کہ ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔

جب معاشرہ میں نئے نظریات و خیالات و افکار پیدا نہ ہو تو ایسا معاشرہ گھٹن کا شکار ہو کر ایک جگہ ٹھہر جاتا ہے۔ آج ہم اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔

عالمگیریت، کلچر اور شناخت

دنیا کی تاریخ میں عالمگیریت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ کسی نہ کسی شکل میں ابھرتی، پھیلتی اور دنیا کو متاثر کرتی رہی ہے۔ فرق اتنا رہا ہے کہ کبھی اس کے پھیلاؤ کی رفتار بہت سست اور مدہم ہوتی تھی، مگر جیسے جیسے ٹکنالوجی میں ترقی ہوئی، ذرائع ابلاغ منظم ہوئے، اسی طرح سے اس کی رفتار میں تیزی آتی چلی گئی اور اب تک اس کے اثرات جو کم محسوس ہوتے تھے اس تیزی سے تبدیل ہونے والے واقعات کی وجہ سے وہ بہت زیادہ محسوس ہونے لگے۔

تاریخ میں عالمگیریت کا تعلق اب تک زیادہ تر سیاسی تسلط سے رہا ہے۔ جب بھی بڑی بڑی ایمپائرز بنیں، اور ان کے سیاسی پھیلاؤ نے دوسرے علاقوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو اس کے ساتھ ہی یہ علاقے معاشی اور کلچرل طور پر ایک دوسرے جڑ گئے۔ اس سیاسی تسلط نے آگے چل کر تجارت و معیشت کے ذریعہ دوسرے علاقوں، اور ملکوں کو بھی متاثر کیا، جس کی وجہ سے ان کا کلچر دور دور تک گیا۔

سکندر مقدونیہ سے اٹھا اور اپنی فتوحات کے ذریعہ ہمسایہ ملکوں کے بعد ایران و ہندوستان کے اور حصہ کو بھی اپنے تسلط میں لے لیا۔ اس کا طوفان تو تباہی و بربادی کے بعد چلا گی، مگر وہ یونانی آبادیاں جو ہمارے علاقوں میں آباد ہوگئی تھیں، ان کے زیر اثر گندھارا کا کلچر ابھرا۔

تاریخ میں عالمگیریت کی یہ مثالیں ہیں جو اب تک چند علاقوں تک محدود تھیں، مگر جب رومیوں نے یورپ اور ایشیا میں اپنی ایمپائر بنائی تو اس کی شکل اور زیادہ پھیلی ہوئی ملی۔ آج اس کی نشانیاں یورپ اور ایشیا دونوں براعظموں میں رومی عمارتوں کے کھنڈرات کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

عربوں نے جب فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو مشرق وسطیٰ، وسط ایشیا اور شمالی افریقہ کے ملکوں کی زبان اور کلچر کو بدل ڈالا، اور ان کی عربی شناخت قائم کردی۔

جب یورپی کلونیل ازم کا دور آیا ہے تو عالمگیریت کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ جہاں

جہاں یہ یورپی ممالک پہنچے، وہاں بقول ان کے وہ "تہذیبی مشن" کے ساتھ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تسلط شدہ ملکوں میں یورپی کلچر پھیلا۔ اس کی دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں سے ایک تو وہ ممالک تھے کہ جن کی سیاسی، معاشی اور کلچرل حالت مضبوط او مستحکم نہ تھی، ان ملکوں میں یورپی اثر ورسوخ بہت تیزی سے پھیلا۔ جن میں خاص طور سے افریقہ کے ملک تھے۔ دوسرے وہ ملک تھے کہ جہاں قدیم تہذیبوں کی جڑیں بڑی گہری اور مضبوط تھیں، ان ملکوں میں یورپی اثرات کی رفتار سست اور دھیمی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر ہندوستان میں یورپی کلچر نے بہت زیادہ خود کو پھیلایا۔

موجودہ زمانے میں ٹکنالوجی کی ترقی نے دنیا کو سکیڑ دیا ہے۔ ملکوں کی سرحدیں برابر کمزور ہورہی ہیں ان حالات میں امریکہ اور یورپ کہ جن کے پاس ٹکنالوجی ہے، علم کی طاقت ہے، اور معاشی قوت ہے، وہ ان کے سہارے برابر اپنے کلچر کو پھیلا رہے ہیں۔ یہ عالمگیریت کی وہ شکل ہے کہ جس کی تیز رفتاری کے آگے ہر چیز راستہ چھوڑ رہی ہے۔ یہ ایک سیلاب کی مانند ہے جو خس وخاشاک کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانا چاہتا ہے۔

اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ کلچر کوئی جامد اور لافانی چیز نہیں ہوتا ہے۔ یہ اندرونی اور بیرونی دباؤ کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اگر کوئی کلچر ایک جگہ ٹھہر کر رہ جائے تو اس کی توانائی اور زندگی ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر اس میں برابر اضافہ ہوتا رہے تو اس میں نئی توانائی بھی آتی ہے اور اس کے اثرات بھی بڑھتے ہیں۔

برصغیر ہندوستان کی مثال دیکھ لیجئے۔ اس میں آریاؤں سے لے کر انگریزوں تک جتنے کلچرل عناصر شامل ہوتے رہے۔ کلچر میں جو روایات، رسوم و رواج، اور عقائد ہوتے ہیں، ان کی افادیت بھی وقت کے سات بدلتی رہتی ہے۔ بہت سی روایات فرسودہ ہو کر یا تو خود ختم ہو جاتی ہیں، یا انہیں اندرونی اور بیرونی دباؤ سے ختم کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ستی کی رسم جو ہندوستانی کلچر کا حصہ بن گئی تھی، وہ کلونیل دور میں خود ہندو معاشرے میں راجہ رام موہن رائے کی تحریک اور کلونیل حکومت کی اصلاحات کے نتیجہ میں ختم ہوئی۔

اس لئے کلچر کی تبدیلی سے ماتم کناں ہونے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ ہمارے ہاں اب برادری، کمبائنڈ فیملی کا نظام، خاندان میں بزرگوں کا مقام اور بچوں کی تربیت کے طریقے، یہ سب وقت کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ پردہ جو کبھی طبقہ اعلیٰ اور متوسط

طبقے کے لئے باعث عزت تھا، اب اس کی عورتیں تعلیم کے بعد ملازمت کرنے گھروں سے نکل رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ تبدیلی مساوی نہیں ہوتی ہیں، یہ ہمیشہ غیر مساوی ہوتی ہیں، مگر وقت کے دباؤ کے ساتھ ان کو روکا نہیں جاسکتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ کسی بھی سماج میں کلچر کے نام پر طبقہ امراء خود کو عام لوگوں سے دور رکھتے ہیں اور اپنے تسلط کو ذہنی طور پر قائم کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ''کلچرڈ'' اور ''نان کلچرڈ'' کی تفریق پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً اس وقت پاکستان میں طبقہ اعلیٰ کے لوگ امریکی یا یورپی کلچر کو اپنائے ہوئے ہیں، اس وجہ سے ان کے اور عام لوگوں کے درمیان کلچر کی ایک خلیج حائل ہے۔ اس لئے پاکستانی سماج میں کسی ایک کلچر کی شناخت مشکل ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی صوبائی کلچر کی شناخت کے لئے ہم اجرک، کھسہ، یا بلوچی ٹوپی کو استعمال کرتے ہیں، مگر وقتی طور پر سیاسی حالات کے تحت ابھرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔

اس لئے جہاں تک شناخت کا مسئلہ ہے، اس کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ کسی بھی فرد کی کوئی ایک شناخت نہیں ہوتی ہے، وہ کئی شناختوں کا مالک ہوتا ہے ان میں سے کوئی ایک شناخت وقت کی ضرورت کے تحت ابھر کر سامنے آجاتی ہے، جب یہ ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو یہ شناخت بھی گم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قومی، لسانی، مذہبی اور فرقہ وارانہ شناختیں ابھرتی اور غروب ہوتی رہتی ہیں۔ کلچر شناخت بھی وقت کی ضرورت کے تحت اپنے چہرے بدلتی رہتی ہے۔

اب اگر عالمگیریت ہماری شناختوں میں تبدیلی لا رہی ہے، تو اس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف عالمگیریت کے سایہ میں یورپی کلچر تسلط کو بڑھا رہا ہے، وہاں ایشیا اور افریقہ کا کلچر بھی اس پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ یورپ و امریکہ میں اس وقت ہندوستانی موسیقی مقبول عام ہوگئی ہے۔ یوگا کی پریکٹس کو جگہ جگہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ برصغیر کے کھانے اور مسالہ جات یورپی و امریکی کلچر کا حصہ بن گئے ہیں۔ دوسری طرف یورپ و امریکہ کے ہر شہر میں ''چائنا ٹاؤن'' موجود ہے۔ طب میں چینی و ہندوستانی دواؤں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اس عالمگیریت میں سب ہی کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔

اس کا انحصار دنیا کی قوموں پر ہے کہ وہ اپنے کلچر کا کتنا حصہ عالمگیریت کو دینا چاہتے ہیں، اور کتنا خود برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔